زندگی اخلاق کے سائے میں

تحریر:

آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ:

سید وزیر حسن رضوی

۷۸۶
۱۱۰-۹۲
یا صاحب الزماں ادرکنی

Knowledge for All
SABIL-E-SAKINA

لبیک یا حُسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری۔

www.ziaraat.com

SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

نام کتاب: زندگی اخلاق کے سائے میں

تحریر: آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہٗ

ترجمہ: سید وزیر حسن رضوی

ناشر: نور اسلام۔ امامباڑہ فیض آباد

کتابت: حسن اختر لکھنؤ

سرورق: ابوالفضل حامد حسن، لکھنو

تعداد: ایک ہزار

سن اشاعت: سنہ ۱۹۸۶ء

مطبوعہ: جوہی آرٹ پرنٹس

قیمت
دس روپے

کہاں کیا ہے

پہلا باب اخلاق وتربیت

صفحہ

دوسرا باب چار اخلاقی اصول قدماء کے نزدیک

تیسرا باب تہذیب اخلاق کی راہ میں پہلا قدم

چوتھا باب سچائی

پانچواں باب غیبت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بطور مقدمہ

اس کتاب میں..
کیا تلاش کر رہے ہیں؟

عالمی پریشانیاں
ظلم و ستم اور جنگ کی قربانیاں
گھریلو تعلقات: روز بروز بڑھتی ہوئی کشیدگی

ہم سب اس حقیقت کے سچے گواہ ہیں کہ دنیا کے موجودہ قوانین، جو ابھی تمام کوششوں کے ساتھ فلاح و بہبود کو تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا بلکہ روزانہ مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

نہیں معلوم کب تک ان فرسودہ قوانین کو آزمایا جاتا رہے گا۔ یہ قوانین خود اپنے سربراہوں کی حمایت سے قاصر ہیں چہ جائیکہ یہ دوسروں کے سلسلے میں کوئی کام انجام دیں۔

یہ قوانین گہرے کنوئیں کی طرح ہیں جہاں پتھر کا ایک بڑا ٹکڑا آجاتا ہے اس

پتھر کو توڑنے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے، سب ناکام ہوتی ہے اور اس سلسلے میں جتنی بھی کوشش کی جائے سب رائیگاں جائے گی اور تکان کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اور پانی کا نام ونشان بھی نہ ملے گا۔

دیکھنا یہ چاہیئے کہ کمی کہاں ہے اور وہ نقص کیا ہے جس کی بنا پر کوششیں رائیگاں ہو رہی ہیں۔ اس کمی کو تلاش کرنا چاہیئے اس کی تشخیص کرنا چاہیئے اور اس کا حل تلاش کرنا چاہیئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قوانین ان دواؤں کی طرح ہیں جن کا استعمال صرف خارجی ہے اور ان کا اثر بھی سطحی ہے۔ یہ قوانین انسان کے ضمیر پر ذرہ برابر بھی اثر انداز نہیں ہوتے تاکہ اس کی قوتوں کو یکجا کرکے درد کا درماں کر سکیں۔

کون سا قانون ان سرمایہ داروں کو فقیروں اور غریبوں کی حمایت پر آمادہ کرسکتا ہے جو اپنا گرانقدر سرمایہ اپنی "بلیوں" کے نام وصیت کرجاتے ہیں تاکہ بلیوں کے لئے آسائش و آرام کے لئے بہترین جگہیں تعمیر کی جائیں۔ کون سا قانون ان لوگوں کے جذبات کو غریبوں کی طرف موڑ سکتا ہے۔

کون سا قانون ان لوگوں کو انسان دوستی پر آمادہ کرسکتا ہے جو کروڑوں روپئے کی مالیت کا ہیرا آویزاں کئے رہتے ہیں اور لاکھوں روپئے صرف کرکے پرانے ٹکٹ خرید کر اپنے گھر کے ایک کونے میں سجاتے ہیں۔ کون سا قانون ان لوگوں کو جذام کے لاکھوں مریضوں کے علاج کی طرف متوجہ کرسکتا ہے اور ان کے دلوں میں لاعلاج مریضوں کی محبت

پیدا کرسکتا ہے۔

کون سا قانون انسان کی سرکشی اور تجاوز کو کنٹرول کرسکتا ہے اور اس کی طاقتوں کو تخریب کے بجائے تعمیر پر لگا سکتا ہے۔

کیا ان قوانین میں اتنی صلاحیت ہے کہ انسان کی روح اور ضمیر کو متاثر کرسکیں اور اس میں انقلاب برپا کرسکیں؟ ظاہر ہے کہ موجودہ قوانین میں سے کسی میں بھی اتنی صلاحیت نہیں ہے۔

یہی وہ منزل ہے جہاں "اخلاق" کی ضرورت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے یہی وہ حقیقت ہے جو دیو پیکر امواج کی طرح تمام رکاوٹوں کو عبور کرلیتی ہے، خلاؤں کو پار کرتی ہوئی انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور ایسا انقلاب برپا کرتی ہے کہ انسان کو حیوان کی صف سے نکال کر واقعی انسان بنا دیتی ہے۔

— وہ انسان جو دوسروں کے رنج و غم میں شریک ہے

— وہ انسان جو اپنے اور دوسروں کے فائدے کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔

— وہ انسان جو اپنا آرام دوسروں کی مشکلات اور مصائب میں تلاش نہیں کرتا۔

— وہ انسان جس کی وسعت فکر و نظر اس بات کا سبب ہوتی ہے کہ وہ ظلم و ستم، تنگ نظری و تعصب اور انتقامی کارروائی سے دُور رہتا ہے اور اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں ہر طرف اچھائیاں ہی اچھائیاں اور نیکیاں ہی نیکیاں ہوتی ہیں۔

ہاں۔ اخلاق کو زندہ کرنا چاہیے اور اس حقیقت سے دوسروں کو روشناس کرانا چاہیے۔ یہ کتاب اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے اور اس کی تالیف میں اسلام کے عظیم مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ناصر مکارم شیرازی
قم۔ حوزہ علمیہ

۱

اخلاق و تربیت

- بد اخلاقی ایک طرح کی بیماری ہے
- تزکیۂ نفس یا جہادِ اکبر
- سعادت و خوش بختی
- سعادت روحانی ہے یا جسمانی
- فردی و سماجی اخلاق
- تحفظِ اخلاق

بسم اللہ الرحمن الرحیم
وبہ نستعین

اخلاق و تربیت

کیا تربیت انسانوں کے اخلاق اور معنویت کو تبدیل کر سکتی ہے یا نہیں؟ یہ وہ سوال ہے جو علم اخلاق کی ضرورت اور اہمیت کو روشن کر دیتا ہے۔ اگر ہم اس بات کے قائل ہو جائیں کہ لوگوں کے اخلاق اور روحانیت کا تعلق ان کے جسم و روح کی بناوٹ اور خلقت سے ہے تو اس صورت میں علم اخلاق کا کوئی فائدہ اور مصرف باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر ہم اس بات کے قائل ہوں کہ انسانوں کے اخلاق تربیت سے بدل سکتے ہیں تو اس علم کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

بعض مفکرین نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اور معتقد ہیں کہ جس طرح وہ درخت جن کے میوے تلخ ہیں، باغبان کی تربیت اور توجہ سے اپنی ماہیت کو بدل نہیں سکتے بلکہ ان کے میوے ہر حال میں تلخ ہی ہوتے ہیں، اسی طرح بداخلاق اور بدخو لوگ تربیت کی بنا پر اپنی روح اور اخلاق کو بدل نہیں سکتے اور اگر معمولی سی تبدیلی پیدا بھی ہوگی تو وہ وقتی اور ناپائیدار ہوگی اور پھر وہ اپنی اصلی حالت کی طرف پلٹ جائیں گے (وہ لوگ کہتے ہیں) انسان کی جسمانی بناوٹ اور اس کے اخلاق کے درمیان بہت گہرا ربط ہے اور دراصل ہر شخص کا اخلاق اس کی خلقتِ جسم و

روح کے تابع ہے لہٰذا انسانوں کا اخلاق قابلِ تبدیلی نہیں ہے۔ شاہد کے طور پر
روایات مثل ــــ الناس معادن كمعادن الذهب والفضة ــــ
"لوگ سونے اور چاندی کی کان کے مانند ہیں" کو پیش کرتے ہیں۔

اس طرزِ فکر کے مقابلے میں اکثر مفکرین کا قول ہے جو معتقد ہیں کہ انسان
کے اخلاق اور ان کی روحانیت تربیت کے ذریعے پوری طرح تبدیل ہوسکتی ہے بے شمار
تجربات جو فاسد الاخلاق افراد پر ہوئے ہیں انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح
ثابت کردیا ہے کہ صحیح ماحول اچھی صحبت اور بہترین تربیت کی بنا پر بہت سے
بُرے اور بدکردار لوگوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام آسمانی پیغامات
جو انبیاء اور اولیاء علیہم السلام کے ذریعے بھیجے گئے، بے کار اور مہمل ہوتے کیوں کہ
ان کا مقصد انسانوں کا تزکیہ نفس تھا۔ اور اسی طرح وہ تمام سزائیں جو اخلاق و
ادب کے لئے دی جاتی ہیں اور دنیا کی تمام اقوام میں رائج ہیں بے فائدہ اور
غیر معقول ہوتیں۔

ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ وحشی جانوروں اور درندوں تک کو رام کرلیا
جاتا ہے اور ان کی خلقت کے برعکس ان سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود
ہم کیونکر یقین کرلیں کہ بداخلاقی انسان کے اندر درندوں کی درندگی سے زیادہ
بنیادی اور محکم ہے۔

ہماری نظر میں اس دعوے کے ثبوت کا بہترین راستہ یہ ہے کہ ہم تلاش
کریں کہ ملکۂ اخلاق کیسے حاصل ہوتا ہے اسی سے اس کے مفقود ہونے کا راز بھی
خود بخود روشن ہوجائے گا۔

ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ ہر اچھا یا برا عمل اپنا جیسا نقش انسان کی روح پر
چھوڑ جاتا ہے اور انسان کی روح کو اپنی طرف جذب کرلیتا ہے اور اس عمل کی تکرار

اس کے نقش کو ابھارتی رہتی ہے اور آہستہ آہستہ اس انسان میں اس عمل کی عادت
پیدا ہوجاتی ہے اور مزید تکرار عادت کو ملکہ میں تبدیل کردیتی ہے۔ اسی طرح انسان کا
باطنی میلان بڑھتے بڑھتے جب عادت اور ملکہ کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو اعمال
کی انجام دہی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے تجربے کی دنیا نے ثابت کردیا ہے
پس جس طرح تکرارِ عمل کی بنا پر عادات و ملکاتِ اخلاقی حاصل ہوتے ہیں اسی طرح تکرارِ عمل
کے ذریعہ زائل بھی ہوسکتے ہیں۔ یعنی پہلے عمل۔ پھر تکرار، اس کے بعد صفت یا ملکۂ
خلاقی کی تشکیل۔

البتہ وعظ و نصیحت، غور و فکر، صحیح تعلیمات اور اچھا ماحول انسان کی روح کو
اخلاقِ حسنہ کی طرف آمادہ کرنے میں کافی موثر ہے۔

بداخلاقی ایک طرح کی بیماری ہے

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ انسان تمام جانداروں میں سب سے امتیازی حیثیت کا مالک ہے
کیونکہ اس کا وجود متضاد صلاحیتوں کا مجموعہ ہے ایک طرف اس کی نفسانی خواہشات اور حیوانی
آرزوئیں ہیں جو اسے سرکشی، تجاوز، عیش پسندی، جھوٹ اور خیانت وغیرہ کی طرف دعوت
دیتی ہیں، اور دوسری طرف قوتِ عقل و ادراک اور ضمیر انسانی ہے جو اسے عدل و انصاف،
محبت و الفت اور پاک دامنی و صداقت، امانت داری و پرہیزگاری کی طرف دعوت دیتی ہے۔
ان متضاد قوتوں کی کشمکش تمام انسانوں میں موجود ہے اور ان طاقتوں کی کامیابی طاقتِ
مخالف کے مقابلے میں اس بات کا سبب بنتی ہے کہ کبھی انسان اخلاقی بلندیوں کو حاصل
کرتے کرتے مقرب فرشتوں سے افضل قرار پاجائے۔ اور کبھی نفسانی خواہشات اس کی
عقل پر غلبہ پاتے پاتے اسے خطرناک درندوں سے بھی پست تر بنا دیتی ہیں۔

بہت سی حدیثوں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت علیؑ کا ارشاد کہ ـــــ

"ان اللّٰہ خص الملك بالعقل دون الشهوة والغضب وخصّ الحیوانات بهما دونه وشرف الانسان باعطاء الجمیع فان انقادت شهوته وغضبه لعقله صار افضل من الملٓئکة لوصوله الی هذه الرتبة مع وجود المنازع"۔ (جامع السعادات جلد ۱ ص ۳۴)

یعنی "خداوند عالم نے فرشتوں کو صرف عقل سے نوازا بغیر غضب اور شہوت کے اور حیوانات کو صرف غضب اور شہوت عطا کیا بغیر عقل کے لیکن انسان کو ان تمام چیزوں سے مشرف فرمایا۔ لہٰذا اگر انسان شہوت و غضب کو اپنی عقل کے تابع قرار دے گا تو فرشتوں سے افضل قرار پائے گا، کیونکہ قوت مخالف کے باوجود اس نے اپنے کو اس منزل پر پہنچایا۔"

لیکن یہاں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ انسان کی نفسانی خواہشات اور آرزوئیں اگر اعتدال کی منزل میں ہوں، نہ صرف مضر نہیں ہیں بلکہ ضروری اور ذریعہ ہیں زندگی کی بقا اور دوام کا۔ (دوسرے لفظوں میں) جس طرح انسان کے جسم کے اندر کوئی عضو بے کار اور بے مصرف نہیں بنایا گیا ہے اسی طرح انسان کی روح کے اندر بھی کوئی غریزہ اور آرزو ایسی نہیں ہے جو اس کی زندگی کے لئے ضروری نہ ہو۔ البتہ ان قوتوں کا بے جا استعمال یا اعتدال سے خارج ہو جانا انسان کی تباہی و ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قوت غضب انسان کی زندگی کے لیے کس قدر ضروری ہے جو قابل انکار نہیں ہے۔ جس وقت کسی انسان کے حقوق پامال کیے جا رہے ہوں۔ اس وقت یہی قوت غضب انسان کو اپنے حقوق واپس لینے پر آمادہ کرتی ہے ورنہ انسان اگر سستی سے کام لے اور اپنے

پورے وجود کو مجسم غیظ و غضب بنا کے نہ پیش کرے تو اپنے حقوق ظالم و غاصب کے پنجے سے نہیں حاصل کر سکتا۔ لیکن یہی غیظ و غضب اگر اپنے مرکز سے منحرف ہو جائیں اور عقل کو اپنا حاکم نہ قرار دیں تو یہی قوتیں انسان کو زندگی کی اس منزل پر پہونچا دیتی ہیں کہ وہ اپنے کو حیوان سے بدتر بنا لیتا ہے اور اس کی غارت گری کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔

اسی طرح انسان کی آرزو مقام و ثروت کے بارے میں اگر حد کے اندر اور معتدل ہو تو بہترین ذریعہ ہے انسان کی ترقی کا، اور یہی قوت انسان کو حصول مقام و ثروت کے لئے وادار کرتی ہے، لیکن اس قوت کے مفاسد بھی واضح ہیں۔ اگر حد اعتدال سے بڑھ جائے تو یہی انسان کو جاہ طلب اور ثروت کا پجاری بنا دیتی ہے۔

جس طرح اعضائے جسم کا عدم اعتدال انسان کو مریض بنا دیتا ہے اور نظام جسم درہم برہم ہو جاتا ہے اسی طرح روحانی قوتوں کا عدم اعتدال بھی روح کے لئے بیماری کا سبب بنتا ہے جسے علمائے اخلاق بیماریِ قلب کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح اصل میں قرآن مجید سے لی گئی ہے جس نے منافق کے نفاق کو مرض کہا ہے: ـــــ

فی قلوبهم مرض فزادهم الله مرضا ۚ (بقرہ آیت ۱۰)

" ان کے دلوں میں ایک طرح کی بیماری ہے اور خداوند عالم نے (ان کی بداعمالیوں کی بنا پر) ان کی بیماری میں اور اضافہ فرما دیا۔"

تزکیۂ نفس یا جہادِ اکبر

اسلام کے نزدیک تزکیۂ نفس یعنی نفس کا برائیوں سے پاک کرنا اتنا ہی اہم ہے کہ اسے جہادِ اکبر کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور یہ تعبیر پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث سے لی گئی ہے جس میں آپؐ نے اپنے اصحاب سے جو کسی جنگ سے واپس ہوئے تھے فرمایا:۔

مرحبا بقوم قضوا الجهاد الاصغر و بقی علیھم الجهاد الاکبر فقیل یارسول اللہ ما الجهاد الاکبر، قال جهاد النفس۔

"مبارک باد ہے اس قوم کے لئے جنھوں نے جہاد اصغر کو انجام دیا اور جہادِ اکبر ان کے لئے ابھی باقی ہے۔ لوگوں نے عرض کی یارسُول اللہ! (ص) جہادِ اکبر کیا ہے، آپ نے فرمایا خواہش نفس کے مقابلے میں جنگ کرنا"۔

(وسائل الشیعہ، کتاب الجہاد)

یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے حدیث نے اپنی کتابوں میں تہذیب اخلاق کی بحثوں کو کتاب جہاد کے اندر ذکر کیا ہے۔ اور اسے جزء جہاد جانا ہے، اور بعض احادیث کے آخر میں یہ جملہ بھی موجود ہے: ———

"ان افضل الجهاد من جاهد نفسه الذی بین جنبیه"

"بہترین جہاد خواہشات نفسانی سے جنگ کرنا ہے جو انسان کے سینے کے اندر ہے"۔

اس بیان کے بعد اچھی طرح یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام اس زندگی بخش اصول کے بارے میں کس نظریہ کا مالک ہے اور اس علم کے بارے میں مطالعہ اور تحقیق کے بعد ان مسائل ذیل کا انکشاف ہوتا ہے۔

(۱) انسان کا وجود متضاد قوتوں پر مشتمل ہے جو ہمیشہ برسرپیکار ہیں اور انسان کی سعادت یا بدبختی انھیں قوتوں کی کامیابی یا ناکامی پر منحصر ہے۔

(۲) اس جہاد کو جہاد اکبر اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا جہاد دائمی اور ابدی ہے جس کے لئے کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نفس سے جہاد ایک جنگِ داخلی ہے اور داخلی جنگ بہرحال خارجی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اور نفس کے مقابلے میں شکست کا نتیجہ سوائے شقاوت اور بدبختی کے کچھ

نہیں ہے حالانکہ دشمن خارجی کے مقابلے میں جہاد ظاہری شکست کے باوجود افتخار شہادت کا حامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جو جہاد دشمنِ خارجی کے مقابلہ میں ہے اس میں شکست واقعی کا تصور ہی نہیں ہے برخلاف جہادِ نفس اور جنگِ داخلی کے یہاں شکست کا احتمال بہت زیادہ ہے۔

(۳) یہ جہاد اگرچہ انسان کے لئے بہت سنگین اور تکلیف دہ ہے لیکن انسان کی سعادتِ ابدی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے اور ترقی و تکامل اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب دو متضاد طاقتیں برسرپیکار ہوں۔ جب تک ہاں اور نہیں میں کشمکش نہیں ہوتی اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ انسان جبتک حوادث و مشکلات سے ٹکر نہیں لیتا اس وقت تک سورما اور بہادر نہیں بنتا۔ جیسا کہ امیرالمومنین ؑ نے فرمایا ہے کہ "جنگلی اور صحرائی درخت جو ہمیشہ طوفان و بادِ مخالف کا شکار رہتے ہیں ان کی لکڑیاں بھی کافی مضبوط ہوتی ہیں اور جلنے میں بھی دیرپا ہوتی ہیں"۔ اسی سے ان متضاد قوتوں کی خلقت کے مصالح معلوم ہوتے ہیں۔ اور نفسانی خواہشات کی خلقت کا راز بھی آشکارا ہو جاتا ہے۔

(۴) دشمن ظاہری اور خارجی کے مقابلے میں جہاد ممکن ہے۔ اغراض مادی یعنی حصول غنیمت یا شہرت کے لئے ہو لیکن جہاد نفس ہمیشہ حصولِ کمال و سعادت ہی کے لئے ہوگا اور اس کی کامیابی انسان کی بلندیِ ہمت، ارادے کی تقویت اور بلندی ایمان و بزرگی شخصیت کی علامت ہوگی۔

سعادت و خوش بختی

علمائے اخلاق نے علم اخلاق کا اصلی مقصد سعادت اور خوش بختی جانا ہے جس کی تلاش میں دُنیا کے تمام ہی انسان حیران و سرگرداں ہیں اور اس کے عدم حصول کی بنا پر

اکثر لوگ رنجیدہ اور پریشان نظر آتے ہیں۔

سعادت کیا ہے؟

سعادت کی تعریف مختصر لفظوں میں یوں کی جا سکتی ہے۔ ہر ممکن کمال تک پہونچنا جس کی صلاحیت انسان کے اندر موجود ہے اور دوسرے لفظوں میں: ان مختلف مادی و معنوی صلاحیتوں سے بہرہ برداری جو انسان کے اختیار میں ہیں۔

لیکن یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ سعادت کا کلی مفہوم جس قدر روشن اور واضح ہے اس کے جزئیات و مصادیق اتنے ہی زیادہ مبہم اور پیچیدہ ہیں اور زیادہ تر لوگ راہِ سعادت حاصل کرنے میں اشتباہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دولتمند شخص جس نے اپنی پوری عمر دولت و ثروت جمع کرنے میں صرف کی ہے وہ اپنے کو اسی دولت و ثروت کے انبار کی بنا پر خوش بخت اور سعادت مند سمجھتا ہے حالانکہ اسی کا بیٹا اپنی سعادت مندی اس بات میں سمجھتا ہے کہ اس جمع شدہ دولت کو اپنی خواہشات کی آگ بجھانے میں صرف کرے۔ جبکہ یہ بات یقینی ہے کہ یہ دونوں اشتباہ کا شکار ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ عقل کو بروئے کار لاکر تجزیہ و تحلیل کے بعد صحیح نتیجے تک پہنچا جائے کہ انسان کی سعادت کا راستہ کون سا ہے اور کس طرح خداداد مادی و معنوی صلاحیتوں سے صحیح فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اگرچہ اس کی صحیح معرفت بغیر مطالعے اور غور و فکر کے ممکن نہیں ہے۔

سعادت روحانی ہے یا جسمانی؟

بعض یونانی فلاسفۂ قدیم مثل (کلبیون) معتقد تھے کہ سعادت کا تعلق صرف روح اور معنویت سے ہے مادی و جسمی کمالات انسان کو ذرہ برابر بھی سعادت مند و خوش بخت

نہیں بنا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ راہِ سعادت کو تنہا منحصر جانتے ہیں اخلاقی فضائل اور معنوی کمالات کے حصول پر۔ بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ سعادت کامل انسان کے لئے اس دنیائے مادی میں ممکن ہی نہیں ہے۔ جب تک روح کا تعلق اس مادی اور کثیف جسم سے ہے سعادت حقیقی سے محروم رہے گی، صرف اسی وقت حقیقی سعادت ممکن ہے جب یہ روح جسم سے جدا ہوگی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ سعادت حاصل کرنے کے لئے تمام مادی چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے تھے، جیسا کہ (دیوجانس) کے حالات سے معلوم ہوتا ہے جو مشہور حکیم تھا، (کلبیون) کا، وہ بجائے گھر اور کمرے کے ایک صحرا میں زندگی بسر کرتا تھا۔ مادی وسائل میں سے اس کے پاس صرف ایک پانی پینے کا برتن تھا۔ اس کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ ایک دن اس نے دیکھا کہ نہر میں کوئی ہاتھ سے پانی پی رہا ہے، اس نے اس برتن کو بھی دور پھینک دیا۔

اس کے مقابلے میں ایک اور مکتبِ فکر ہے جو سعادت کو بغیر کسی قید و شرط کے حصول مادّہ اور لذّتِ مادی جانتے ہیں چاہے وہ کسی راستے سے بھی حاصل ہو اور کسی قاعدے، قانون اور شرع و شریعت کے پابند نہیں ہیں، ہر قانون کو محکوم قرار دیتے ہیں۔

سعادت کلی ان لوگوں کی نظر میں صرف مادی لذتوں کے حصول کا نام ہے اور اس کو حاصل کرنے میں یہ لوگ دیوانہ وار آگے بڑھتے جاتے ہیں اور اس کے مقابلے میں کسی اخلاقی و اجتماعی قانون کی پروا نہیں کرتے بلکہ سارے آداب پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

یہ بات روشن ہے کہ یہ طرز فکر جسے غریبوں اور غربت زدہ ممالک نے اپنا رکھا ہے اور اسے روز بروز وسعت دیتے جا رہے ہیں، اسے مکتب یا فلسفہ نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ ایک

طرح کا جنون اور قلبی بیماری ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے دراصل عکس العمل ہے ان تند رو اور افراطی مکتبوں کا جسے "کلبیون" جیسے لوگوں نے اپنا رکھا تھا کہ انھوں نے جنبۂ مادی اور جسمی کو سعادت سے بالکل الگ کر دیا تھا۔

مکتب میانہ

چونکہ انسان تنہا رُوح یا تنہا جسم نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت دونوں چیزوں سے مرکب ہے اس لئے سعادت کو بھی دونوں حصوں میں تلاش کرنا چاہیئے اور یقیناً جو مکتب انسان کے صرف ایک جزء کی طرف توجہ دے گا وہ سعادت انسان کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسا مکتب واقعی دنیا میں قابل عمل نہیں ہے۔ اور جسم اور مادہ کے مقدمہ اور روح کے ذوالمقدمہ یعنی جسم و مادّہ زینہ ہیں اصل مقصد یعنی روح کی ترقی کے لئے۔ اسے کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔

فلاسفۂ یونان میں معلم اوّل ارسطو اور اس کے پیرو اسی نظریہ کے مالک تھے اور اسلام کی عالی تعلیمات کھل کر اس مکتب کی تقویت کرتی ہیں اور اس مکتب کے لئے نئے اصول پیش کیے ہیں؛ یہ حقیقت قرآن مجید کی متعدد آیتوں اور رہبران اسلام کے بیانات میں بخوبی آشکار ہے اور اسلام کا شعار اس موضوع میں اس آیت کے اندر موجود ہے۔

فمن الناس من يقول ربنا آتنا فی الدنيا حسنة وما له فی الآخرة من خلاق ومنهم من يقول ربنا آتنا فی الدنيا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار اولئك لهم نصيب مما كسبوا والله سريع الحساب ط

(البقرۃ آیۃ ۲۰۰-۲۰۱)

"بعض لوگ کہتے ہیں پالنے والے ہمیں دُنیا میں نیکی مرحمت فرما لیکن

آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ معبود ہمیں دُنیا و آخرت دونوں میں نیکی مرحمت فرما اور ہمیں عذاب دوزخ سے محفوظ رکھنا۔ یہ لوگ اپنے اعمال کی جزا پائیں گے اور خداوند عالم بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔"

ان بحثوں میں اس نکتے کی طرف پوری توجہ ہونی چاہیئے کہ جسم و رُوح کے درمیان بہت قریبی اور گہرا ارتباط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک میں معمولی سا انحراف دوسرے پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

علم نفسیات نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ بعض اخلاقی اور فکری انحراف کا سبب مادی و فطری خواہشات کی تشنگی ہوتی ہے۔ فطری خواہشات و تقاضوں کی تشنگی و ناکامی کی بنا پر بھی انسان کی روح میں ایک گرہ پڑ جاتی ہے اور اس طرح کے نفسیاتی عقدے علمائے اخلاق کے لئے ایک بڑی مشکل بن جاتے ہیں اور اس گرہ کا کھولنا ان طریقوں سے جو علماء اخلاق نے تزکیہ نفس کے لیے معین کیا ہے عام طور پر ممکن نہیں ہوتا بلکہ اس کا علاج اسی راستے سے ممکن ہے جس سے یہ گرہ پڑی ہے۔۔۔ یعنی جسمانی تقاضے صحیح طور پر پورے ہوں۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ان خواہشات کی عدم تسکین کی بنا پر غلط بینی، خوف، حسد، غرور و تکبر اور کینے جیسے بُرے صفات کا مرکز بن جاتے ہیں، لہٰذا آج تمام علمائے اخلاق کو چاہیئے کہ وہ تربیت رُوح کے لئے جسم اور رُوح دونوں کے حالات کو نظر میں رکھیں، تاکہ انھیں کامیابی حاصل ہو سکے۔

اسلام نے واضح طور سے اس اہم مسئلے کے بارے میں بھی رہنمائی کی ہے اور قرآن مجید کا صاف اعلان ہے:۔

قل من حرم زينة الله التی اخرج لعباده

والطیبات من الرزق قل ھی للذین امنوا فی الحیٰوۃ الدنیا. (اعراف ۳۲)

"اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ کس نے پاکیزہ رزق اور الٰہی زینتوں کو تم پر حرام قرار دیا ہے جبکہ ان چیزوں کو اس نے اپنے بندوں ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے اے پیغمبر کہ یہ نعمتیں ایمان والوں کے لئے ہیں اس دنیاوی زندگی کے لئے"۔

اس آیۂ کریمہ میں لفظ عباد اور جملہ والذین آمنوا اور زینت کی اضافت اللہ کی طرف توجہ اور فکر کی طالب ہے۔

علیؑ کے کلمات قصار کے اندر ارشاد ہے: ——————

للمؤمن ثلاث ساعات فساعۃ تناجی فیھا ربہ وساعۃ یرم معاشہ وساعۃ یخلی بین نفسہ وبین لذاتھا فیما یحل و یجمل .... اور بعض روایات میں یہ جملہ بھی مذکور ہے: وذلک عون علی سائر الساعات۔

"مومن کے رات و دن کا پروگرام تین حصّوں پر منقسم ہے ایک حصّہ اپنے خالق سے راز و نیاز سے مخصوص ہے، دن کے دوسرے حصّے میں وہ اپنی ضروریاتِ زندگی اور معاش کی فکر میں رہتا ہے، اور تیسرا حصّہ وہ ہے جس میں وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے محظوظ ہوتا ہے اور یہ حصّہ اس کی زندگی کے تینوں شعبوں کے لئے معاون اور مددگار ثابت ہوتا ہے"۔

فردی و سماجی اخلاق

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ تمام اخلاقی اصولوں کی بازگشت انسان کی سماجی اور اجتماعی

زندگی کی طرف ہے اور اگر سماج یا معاشرہ کا وجود نہ ہوتا اور ہر شخص تنہا تنہا زندگی بسر کرتا اسے دوسروں کی کوئی خبر نہ ہوتی تو اس صورت میں اخلاق بے معنی ہوتا۔

کیونکہ رشک و حسد، تکبّر و انکساری، خوش فہمی و عدالت، ظلم و پاکدامنی، سخاوت و بخل وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق صرف انسانوں کی سماجی اور اجتماعی زندگی سے ہے جس میں لوگوں کے درمیان ارتباط برقرار ہو۔ لہٰذا وہ انسان جو سماج سے الگ ہے اس شخص کے ساتھ ہوگا جو اخلاق سے دور ہو، بلکہ جو انسان سماج سے دور ہے وہی اخلاق سے بھی دُور ہوگا۔

لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے رُوحانی و اخلاقی کمالات اور اسی طرح بہت سے روحانی و اخلاقی امراض معاشرے کی دین ہیں، جو غیر سماجی زندگی میں حاصل نہیں ہوتے۔ لیکن ایسا قطعاً نہیں ہے کہ انفرادی زندگی میں اخلاق کا کوئی مفہوم نہ ہو، کیونکہ بہت سے اخلاقی اصول ایسے بھی ہیں جن کا تعلق صرف فرد اور انفرادی زندگی سے ہے۔ مثال کے طور پر جیسے صبر و جزع مصیبت کے وقت، بہادری اور بزدلی حوادث کے مقابلے میں، سستی و استقامت مقصد تک پہونچنے کے لئے اپنے خالق کے بارے میں توجّہ یا غفلت، اس کی نعمتوں کے مقابلے میں شکر یا کفرانِ نعمت وغیرہ جسے علماءِ اخلاق نے اپنی اخلاق کی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں بحث کی ہے اور اسے فضائل یا رذائل اخلاقی کا جزء جانا ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو اس انسان پر بھی صادق آتے ہیں جو معاشرے سے بالکل الگ زندگی بسر کرتا ہو۔

اس بحث کے بعد اخلاق کی تقسیم، اخلاق فردی اور اخلاق اجتماعی پر صحیح اور واضح ہے۔ البتہ یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ اخلاقِ اجتماعی کا پلّہ علمِ اخلاق میں کافی سنگین اور بھاری ہے اور انسان کی شخصیت کا دار و مدار زیادہ تر سماجی اخلاق پر ہے اگرچہ اخلاقِ فردی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اشتباہِ عظیم

ایک دوسرا نکتہ جس کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ جو لوگ تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کے لئے معاشرہ سے کنارہ کشی اور انفرادی زندگی کو ضروری تصوّر کرتے ہیں وہ لوگ سخت اشتباہ کا شکار ہیں کیونکہ وہ لوگ اخلاق اجتماعی کا سرے سے انکار کرنا چاہتے ہیں، اور یہ گوشہ نشینی اور کنارہ کشی اگرچہ بعض بُرائیوں سے محفوظ رکھتی ہے لیکن اس کو فضیلت حساب نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ اس کے مانند ہے کہ جیسے کوئی شخص جنسی بُرائیوں سے بچنے کے لیے اپنے کو عضوِ تناسل سے محروم کرلے، اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ ایسا شخص بے عفتی کا شکار نہیں ہوگا لیکن یہ اس کے لئے فضیلت حساب نہیں کی جائیگی

اس کے علاوہ تجربہ کی دنیا شاہد ہے کہ ایسے افراد جو معاشرے سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے ہیں، بہت سی اخلاقی بُرائیوں میں بھی ملوث ہو جاتے ہیں جیسے کج خلقی، غرُور و تکبر اور سوءِ ظن، تقدیر و فیصلہ خداوندی کے بارے میں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث علیحدہ کی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے اور سوادِ اعظم نے بھی اس کی طرف تشویق کی ہے اور سماج میں اصولِ اخلاقی کے نفاذ کی تاکید کرتے رہے ہیں۔

اخلاقی اِمراض کے مُعالجہ کی راہ

یہاں تک علم اخلاق کی غرض، اس کی اہمیت اور فردی و سماجی زندگی کے لئے اس کے لزوم کے بارے میں بحث کی گئی۔ اب یہاں اخلاقی اصولوں کے جزئیات، اخلاقی امراض کا طریقۂ علاج وغیرہ کے بارے میں بحث ہوگی۔ یہاں دو نکتوں کی طرف توجہ دلانا انتہائی ضروری ہے۔

اوّل:۔ اس قانون کی طرف ہمیشہ توجہ رہنی چاہیے کہ جو لوگ اخلاقی امراض کے شکار ہیں ان سے ایک مریض جیسا برتاؤ کرنا چاہیے جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا کہ یہ ایک طرح کی روحانی بیماری ہے جو کبھی کبھی جسمانی بیماری کا سبب بھی بنتی ہے اور کبھی کبھی جسمانی بیماریاں بھی اخلاقی انحراف کا سبب قرار پاتی ہیں، لہٰذا یہاں بھی ان اصولوں کی رعایت ضروری ہے جن کا لحاظ جسمانی امراض کے معالجہ میں کیا جاتا ہے۔

جسمانی بیماریوں کے علاج کے سلسلے میں تین اصولوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے

۱۔ مرض کی تشخیص

۲۔ مرض لاحق ہونے کے اسباب

۳۔ مرض کے علاج کا طریقہ

۱۔ بیماری کی تشخیص کے لئے عام طور سے اس کی علامتوں اور آثار سے استفادہ

کیا جاتا ہے. لیکن یہ کام جسمانی بیماریوں میں آسان ہے خاصکر آج کل جبکہ ہر قسم کے آلات ایجاد ہو چکے ہیں لیکن اخلاقی بیماریوں کی شناخت کافی مشکل اور پیچیدہ ہے کیونکہ کبھی اخلاق امراض سے مشابہ آثار پائے جاتے ہیں اور کبھی بہت سی روحانی بیماریوں کی علامت ایک ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے مرض کی تشخیص مشکل ہوتی ہے اور عالم اخلاق و طبیب روحانی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے یا دوسروں کے علاج کے سلسلے میں کافی باحوصلہ ہو اور کافی غور و فکر اور تحقیق سے کام لے۔

۲۔ عام طور سے شخص منحرف کے گزشتہ حالات، خاص کر بچپن کی زندگی (جو انسانی زندگی کے لئے بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتی ہے) اس کا گھریلو اور سماجی ماحول کام اور پیشہ اس منطقے کی جغرافیائی حیثیت، ان تمام چیزوں کے بارے میں پوری طرح تحقیق کرنی چاہیئے تاکہ معلوم ہو سکے کہ روحانی بیماری کے اسباب کیا ہیں اور کبھی کبھی یہ روحانی بیماری خاندانی بھی ہوتی ہے جس طرح بعض جسمانی بیماریاں۔ لہٰذا خاندان کے بارے میں بھی تحقیق کرنی چاہیئے۔

۳۔ اخلاقی امراض کا علاج

اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اگر بیماری پرانی ہے اور جڑ پکڑ چکی ہے تو بہت صبر و ضبط اور حوصلے کے ساتھ وقت سے اس کا علاج کرنا چاہیئے۔ معالجہ کی مدت طولانی ہونے سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے، اس کے برخلاف اگر مرض سطحی اور تازہ ہے ابھی جڑ نہیں پکڑی ہے تو اس کا علاج بھی آسان ہے اور کافی کم مدت میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کم سن اور جوان لوگوں کی اخلاقی بیماریوں کا علاج بڑے اور سن رسیدہ لوگوں کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے کیونکہ نوجوان طبقہ بہت جلد منحرف بھی ہو جاتا ہے اور اس کی اصلاح بھی جلد ہو جاتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: علیک بالاحداث فانهم

اسرع الیٰ کل خیر۔

"نوجوانوں کی طرف توجہ کرو، کیونکہ وہ بہت جلد ہر اچھائی کو اپنانے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

تحفّظ اخلاق

دوسری بات جو یہاں قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ آج کی طب دو حصوں پر منقسم ہے:۔ ۱۔ طبِّ مُعالجی ۲۔ طبِّ تحفّظی۔ طب معالجی کا مفہوم واضح ہے لیکن طب تحفظی وہ ہے جو امراض سے محفوظ رکھ سکے اور ان کے اسباب پیدا نہ ہونے دے اور چونکہ بیماری کا دفاع کرنا اور روک دینا بیماری کے علاج سے بہت زیادہ آسان ہے، اسی وجہ سے طب تحفظی کو انسانوں کی زندگی اور سماج کی بہبودی کے لئے کافی اہمیت دی گئی ہے اور اس شعبے پر کافی سرمایہ صرف کیا جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح اخلاقی مسائل کے لئے بھی دو شعبے معین ہیں، لہٰذا اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ اخلاقی انحراف پیدا نہ ہونے پائے اور ضروری تدابیر کے ذریعے اپنے اور دوسروں کے اخلاق کو محفوظ رکھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل امور کی رعایت ضروری ہوگی:۔

۱۔ غلط اور مشتبہ معاشرت سے اجتناب

یہ بات قطعی ہے کہ بہت سی اخلاقی بیماریاں غلط معاشرت کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے بعض جسمانی امراض معاشرت کی دین ہیں۔ معاشرت ان لوگوں کے لئے اور بھی سم قاتل ہے جو ابھی کم سن ہیں، یا جن کی معلومات کم اور سطحی ہیں یا جن کا ایمان محکم نہیں ہے کیونکہ ان صورتوں میں انسان کی روح دوسروں کے اخلاق کو اپنانے کے لئے آمادہ ہوتی ہے ایسے لوگوں کے لئے بری صحبت ہلاکت کا سبب

قرار پاتی ہے۔

اکثر یہ بات دیکھی گئی ہے کہ صحبت کی بنا پر انسان بالکل بدل جاتا ہے اور ایک راہ سے دوسری راہ پر گامزن نظر آتا ہے۔ صحبت ایسی چیز ہے جو انسان کی تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

صحبت و معاشرت انسان کی شخصیت کو سنوارنے میں کافی موثر ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کو پہچاننے کے لئے اس کے دوستوں اور جن کے ساتھ بیٹھتا اٹھتا ہے، ان کو دیکھنا چاہیئے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ——

من اشتبه علیکم امرہ ولم تعرفوا دینه فانظروا الی خلطائه۔

"جس شخص کی حقیقت تم پر روشن نہ ہو اور اس کے دین سے واقف نہ ہو اس کے دوستوں کو دیکھو۔"

—— (کتاب صفات شیعہ صدوق)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ——

المرء علیٰ دین خلیله وقرینه۔

"انسان اپنے دوستوں اور ساتھ بیٹھنے والوں کے دین پر ہوتا ہے۔"

—— (کتاب کافی)

بروں کی صحبت انسان کی روح کو تاریک، اس کی قوت تشخیص کو ضعیف اور برے اعمال اور بداخلاقیوں سے نفرت کو سبک اور کم کر دیتی ہے جسے روایات کی اصطلاح میں دل کی موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ——

اربعة یمتن القلب ... ومجالسة الموتیٰ فقیل یا رسول اللہ وما الموتی قال کل غنی مسرف۔

"چار چیزیں دل کی موت کا سبب ہیں ان میں سے چوتھے مردوں کی صحبت ہے۔ لوگوں نے عرض کی اے خدا کے رسول! مردہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا فضول خرچ ثروت مند۔"

—— (خصال صدوق رح)

بروں کی صحبت احساس بدگمانی کو برانگیختہ کرتی ہے اور انسان کو ہر ایک سے بدظن کر دیتی ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کا ارشاد ہے: ——

مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخیار۔

"بروں کی معاشرت نیک لوگوں سے بدگمانی کا سبب ہے۔"

صحبت اور معاشرت اتنی ہی زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبروں تک کو بروں کی معاشرت سے ڈرایا ہے اور اس کے برعکس نیکوکاروں کی صحبت کو اہم ترین وسیلہ قرار دیا ہے۔ تربیت روح، تزکیہ نفس، اخلاقی فضائل کی پرورش دل کی زندگی اور حصول عزت و شرف کا۔

دین اسلام نے اچھوں کی معاشرت پر کافی زور دیا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ: ——

واصبر نفسك مع الذین یدعون ربهم بالغداوة والعشی یریدون وجهه ولا تعد عیناك عنهم ترید زینة الحیوٰة الدنیا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هواه وکان امره فرطا (کہف۔ ۲۸)

"اُن لوگوں کی صحبت اختیار کرو جو صبح و شام خدا کو یاد کرتے ہیں اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں اور ہرگز زنگینیٔ دنیا کی خاطر ان سے کنارہ کشی نہ اختیار کرنا اور اُن لوگوں کی پیروی نہ کرنا جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے محروم رکھا ہے، وہ لوگ اپنی خواہشات کے غلام بن چکے ہیں اور وہ لوگ افراط اور گمراہی کے راستے پر گامزن ہیں۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ـــــ

اسعد الناس من خالط کرام الناس۔

"سب سے خوش بخت انسان وہ ہے جو نیکوکار لوگوں کی صحبت اختیار کرے"۔ (امالی صدوق)

۲۔ سماج کی اِصلاح

وہ معاشرے جو گناہ اور بُرائیوں سے آلودہ ہیں، بالخصوص وہ سماج جہاں گناہ علی الاعلان انجام دیئے جاتے ہیں، اخلاقی مفاسد کے خطرات کہیں زیادہ ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا جو اقدامات تحفظ اخلاق کے لئے کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ سماج کی بُرائیوں کو روکا جائے، تاکہ کھُلم کھُلا کوئی گناہ کا مرتکب نہ ہو سکے۔

اصُولی طور پر گناہ اور بُرائی سے بچنے کے لئے اہم ترین مانع انسان کی نظر میں گناہ کی عظمت کا مجسم ہونا اور اس سے نفرت کا جذبہ ہے۔ گناہوں کا کھُلے عام ارتکاب اس کی اہمیت کو گھٹاتا ہے اور اس سے نفرت کو کم کرتا ہے، اور انسان کی رُوح کو اسکے ارتکاب کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے لوگوں کی نظر میں گناہ کی عظمت کو تازہ کرنے کیلئے حکم دیا ہے کہ گناہوں کی سزا مجمع عام میں اور لوگوں کے سامنے دی جائے۔

ولیشهد عذابهما طائفة من المؤمنین ۔

ـــــ (سورۂ نور - ۲)

"زانی مرد اور عورت کی سزا کا بعض مومنین مشاہدہ کریں"۔

تاکہ گناہ کی عظمت و اہمیت جو کم ہو گئی تھی پھر سے لوگوں کی نظر میں تازہ ہو جائے۔

اسلام نے گناہ و فساد کے اعلان و اظہار کو بے حد اہمیت دی ہے اور اعلانِ فسق و گناہ کو اس کی شخصیت اور احترام کی تذلیل و تحقیر کا باعث جانا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ـــــ

اذا جاهر الفاسق بفسقه فلا حرمة له۔

"جس وقت گناہ گار گناہ کو علی الاعلان انجام دیتا ہے تو اس کا احترام سلب ہو جاتا ہے"۔ (وسائل الشیعہ کتاب الحج۔ ابواب العشرة)

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: ـــــ

ثلثة لیس لهم حرمة صاحب هوی مبتدع والامام الجائر والفاسق المعلن بفسقه۔

ـــــ وسائل الشیعہ (اصحاب میں)

"تین اشخاص احترام کے لائق نہیں ہیں: دین میں بدعت ایجاد کرنے والا، ظالم حکمراں اور علانیہ گناہ انجام دینے والا"۔

یہاں تک کہ وہ مطالب جو گناہ و فساد سے متعلق ہیں اگر ان کے بیان سے آلودگی، فکر، یا سماج میں اس کے ارتکاب کا اندیشہ ہے تو اسلام کے نظر میں ان کا بیان کرنا بھی حرام ہے۔

پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ـــــ

من سمع فاحشة فافشاها کان کمن اتاها و

من سمع خیرا فافشاہ کان کمن عملہ۔

______ (وسائل الشیعہ۔ کتاب الحج)

"جو شخص کسی بُرائی کو سُنے اور اسے بیان کرے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے اس گناہ کو انجام دیا ہے اور جو شخص کسی نیکی کو سُنے اور اس کا پروپیگنڈہ کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے اس نیکی کو انجام دیا ہے۔"

خلاصہ آلودہ اور مسموم معاشروں کی اصلاح بُرائیوں کی روک تھام، اور اس کو علی الاعلان انجام نہ پانے دینا ایک وسیلہ ہے اخلاقی انحراف سے بچاؤ کا، اور اس کے بغیر ناممکن ہے کہ انسان اپنے یا دوسروں کے اخلاق کی اصلاح کر سکے۔

بالکل اسی طرح جس طرح جسمانی بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے جراثیم کے مرکزوں کو دفع کرنا پڑتا ہے، رہن سہن کی جگہوں، آب و ہوا اور غذا کو جراثیم کی آلودگی سے پاک رکھنا پڑتا ہے اسی طرح اسبابِ انحراف اور بداخلاقی کے جراثیم سے بھی معاشرہ کو پاک رکھنا پڑے گا۔

۳۔ آلودہ معاشرہ سے ہجرت

معاشرہ کی اصلاح اور تبدیلی کی حتی الامکان کوشش کرنا چاہیئے، لیکن اس کے باوجود بھی اگر سماج کی اصلاح ممکن نہ ہو اور یہ خطرہ ہو کہ اس آلودہ ماحول میں رہ کر خود بھی گناہ میں آلودہ ہو جائے گا اور کوئی دوسرا ماحول موجود ہو جہاں وہ برائیوں سے بچ سکتا ہو اس صورت میں اگر اس کے لئے ممکن ہے تو اس پر واجب ہے کہ ہجرت کرے۔

اس کی مثالیں جسمانی بیماریوں کے اندر بھی موجود ہیں کہ جو لوگ اپنی سلامتی جسم کے خواہش مند ہوتے ہیں وہ فوراً آلودہ ماحول سے ہجرت کر کے اچھی آب و ہوا والے علاقوں کو انتخاب کرتے ہیں۔

مسئلۂ مہاجرت اسلام میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، یہ مسئلہ تاریخ اسلام کی اساس اولی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلعم کا مکہ سے مدینہ ہجرت فرمانا صرف آلودہ ماحول کو چھوڑ کر ایسے ماحول کو منتخب کرنا تھا، جہاں نشر ایمان و فضیلت انجام پا سکے۔

اس موضوع کا دوسرا نمونہ سچے مسلمانوں کے ایک گروہ کا مکہ سے حبشہ ہجرت کرنا تھا فرمان پیغمبر ص کے مطابق۔

صدر اسلام کے مہاجرین کو تاریخ اسلام میں ایک خاص درجہ و مقام حاصل ہے جس کی طرف قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بہت سی احادیث بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں کہ آلودہ ماحول سے صحیح سلامت ماحول کی طرف ہجرت کرنا چاہیئے جس سے اس موضوع کی اہمیت بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔ تفسیر مجمع البیان میں آیۂ

ومن یھاجر فی سبیل اللہ یجد فی الارض مراغما کثیرا وسعۃ۔ (سورہ نساء۔ ۱۰۰)

پیغمبر اسلام ص سے نقل کیا ہے: ______

من فر بدینہ من ارض الی ارض وان کان شبراً استوجب الجنۃ وکان رفیق ابراھیم ومحمد (ص)۔

"جو شخص اپنے دین کی وجہ سے ایک سرزمین سے دوسری سرزمین کی طرف ہجرت کرے چاہے ایک ہی بالشت کی مسافت ہو وہ شخص جنت کا مستحق ہے اور حضرت ابراہیم ع اور حضرت محمد ص جیسے دو عظیم پیغمبروں کا ہم نشین ہو گا جنھوں نے ہجرت کی ہے۔"

ایک بالشت کی قید سے اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام

اور پیغمبر اکرمؐ کی مصاحبت اس واسطے ہے کہ ان دو عظیم پیغمبروں نے ہجرت کی طرف اقدام فرمایا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بابل سے جو بُت پرستوں اور نمرودیوں کا مرکز تھا، شام اور فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی اور پیغمبر اسلامؐ نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں آیۂ مبارکہ :——

یاعبادی الذین آمنوا انّ ارضی واسعۃ فایای
فاعبدون ۝ —— (عنکبوت ۵۶)

کے ضمن میں امام حسن عسکری علیہ السّلام سے نقل کیا ہے :۔

لا تطیعوا اھل الفسق من الملوک فان خفتموھم
ان یفتنوکم عن دینکم فان ارض واسعۃ۔

"فاسق حکمرانوں کی اطاعت مت کرو اور اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ وہ تمھیں اپنے مقدس دین سے منحرف کردیں گے تو ہجرت کرو، کیونکہ ہماری زمین بہت وسیع اور کشادہ ہے۔"

اسلام نے ان محفلوں میں جو شرکت کو حرام قرار دیا ہے جہاں گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے یا اجنبی عورت کے ساتھ رہنے سے جو منع کیا ہے یہ بھی ایک طرح کی مہاجرت ہے منطقہ گناہ اور لغزش سے تاکہ انسان مفاسد اخلاقی کا شکار نہ ہو۔ اور گناہ سے محفوظ رہے۔

۲

چار اخلاقی اصول

قدماء کے نزدیک

- تحقیق و تنقید
- اچھے اور برے اخلاق کو پرکھنے کا معیار
- گوشہ نشینی کے اثرات اخلاق پر
- حامیانِ معاشرت اور گوشہ نشینی کے دلیلیں
- بعض موارد جہاں گوشہ نشینی جائز ہے
- مراقبہ اور محاسبہ

چار اخلاقی اصول

قدماء کے نزدیک

سب سے پہلے علم اخلاق کے ان اصولوں کو دیکھا جائے جو اس فن کے علماء نے مرتب کیے ہیں اور اس کے بارے میں مختصراً بحث و تحقیق کی جائے۔

علمار اخلاق نے فضائل اخلاقی کو چار اصولوں میں خلاصہ کیا ہے:۔

۱۔ حکمت

۲۔ عفت

۳۔ شجاعت

۴۔ عدالت

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ چاروں اصول حد وسط ہیں، نفسانی قوتوں کی اس ترتیب سے کہ ان کے دونوں طرف رذائل اخلاقی ہیں جو افراط اور تفریط ہیں نفسانی خواہش کی اس ترتیب کے ساتھ۔

۱۔ حکمت۔ یعنی واقعات کا صحیح ادراک اور اس کی تشخیص میں اعتدال برتنا، ادراک کے افراط کو "عیّاری" اور تفریط کو "نادانی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۔ عفّت۔ یعنی نفسانی خواہشات کا استعمال اعتدال کے ساتھ اور خواہشات

تقاضوں سے صحیح فائدہ حاصل کرنا، اس میں زیادتی وافراط کو شہوت پرستی و حرص اور تفریط کو کاہلی سے تعبیر کرتے ہیں۔

۳۔ شجاعت۔ قوتِ غضب کے استعمال میں میانہ روی اور اعتدال کو شجاعت کہتے ہیں، اس کی زیادتی وافراط کو تہور و بیباکی اور تفریط کو بزدلی اور جبن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۴۔ عدالت۔ یعنی قوتِ شہوانیہ اور قوتِ غضب کا عقل کے تابع ہونا اور عقل کی روشنی میں راہ اصلاح وسعادت کو طے کرنا، اس میں افراط کو ظلم اور تفریط کو انظلام اور تحمل ظلم کہا جاتا ہے۔

یہ فلاسفہ قدیم ایک اعتبار سے رذائل اخلاقی کو لامحدود وغیر متناہی جانتے ہیں۔ حالانکہ فضائل اخلاقی جو حدِ وسط اور نقطۂ اعتدال ہیں، ان کا صرف ایک ہی مرحلہ ہے، اسی وجہ سے ان کو مرکز اور دائرے سے تشبیہ دیتے ہیں، جو ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے اور رذائل اخلاقی کو نقاط لامحدود سے تشبیہ دیتے ہیں جو اس کے دونوں طرف فرض کیے گئے ہیں۔

اور کبھی یہ لوگ فضائل اخلاقی کو خطِ مستقیم سے تعبیر کرتے ہیں جو دو نقطوں کے درمیان میں واقع ہے اس کا مطلب بھی وہی ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان غیر مستقیم اور منحنی بہت سے خطوط ہوتے ہیں۔

محقق طوسی خواجہ نصیر الدینؒ اور بعض دوسرے محققین سے منقول ہے کہ صراط جس کی توصیف روایات میں یوں کی گئی ہے:— "ادق من الشعر واشد من السیف"— (یعنی۔ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز) اس سے مراد اعتدال اخلاقی ہے۔

بعض دوسرے علمار اخلاق نے اس موضوع کی یوں تفسیر کی ہے کہ دُنیائے آخروی

چونکہ اس دُنیا کے حالات کا مجسّمہ اور عکس ہے لہٰذا ممکن ہے کہ صراط عکس اور مجسّمہ ہو اس دُنیا کے ملکاتِ اخلاقی کی میانہ روی اور اعتدال کا۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ چار اصول کہاں سے آئے۔ اس کا علمائے اخلاق یہ جواب دیتے ہیں کہ نفسِ انسانی تین قوتوں کا مالک ہے:

۱۔ قوتِ تشخیص وادراک

۲۔ قوتِ جلب منفعت یا قوتِ جاذبہ جسے اور وسیع پیمانے پر شہوت کہتے ہیں۔

۳۔ قوتِ دفع ضرر یا دافعہ جسے دوسرے لفظوں میں قوتِ غضب کہتے ہیں۔

انھیں تین قوتوں کے اعتدال سے تین فضائل اخلاقی حکمت، عفت اور شجاعت وجود میں آتے ہیں اور جس وقت دو قوتیں قوتِ شہوت وغضب، قوتِ تمیز وادراک کی تابع قرار پاتی ہیں تو ایک چوتھی صفت، اور فضیلت یعنی (عدالت) حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں، ان تینوں مذکورہ قوتوں کا تنہا اعتدال ایک، ایک فضیلت کا حامل ہے اور جب یہ تینوں آپس میں مرتبت ہوتے ہیں یعنی قوتِ شہوت وغضب قوت ادراک کی پیرو ہوتی ہے تو اس سے ایک دوسری فضیلت حاصل ہوتی ہے کیونکہ اکثر انسان شجاعت کا مالک تو ہوتا ہے اور میدانِ جنگ میں بے خوف وخطر بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ شجاعت غلط جگہ استعمال کی جائے مثلاً زمین یا ریاست حاصل کرنے کے لئے، یہاں شجاعت ہوگی لیکن عدالت نہیں پائی جائے گی۔ لیکن یہی شجاعت اگر ایک عالی مقصد مثلاً حکومت عادلانہ قائم کرنے کے لئے پیش کی جائے تو عدالت بھی شجاعت کے ہم رکاب ہوگی۔

تحقیق و تنقید

فلاسفۂ قدیم نے اخلاق نیک و بد کے لئے جو اصول پیش کئے ہیں جس کی تشریح اس سے پہلے کی بحث میں کی گئی بظاہر تو اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن اعتراضات سے خالی نہیں ہیں۔

۱۔ بعض ایسے فضائل اخلاقی بھی ہیں جن کو ان چار مذکورہ اصولوں کے تحت قرار دینا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر نوع دوستی، ایثار اور فداکاری۔ ان فضیلتوں کو مشکل سے عفت کے اندر جگہ دی جا سکتی ہے کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ کسی کی شہوانی قوتیں اعتدال کے اوپر ہوں اور وہ ایثار و فداکاری اور نوعدوستی سے بھی کام نہ لیتا ہو یعنی نہ تو وہ کسی کے حقوق کو پامال ہی کرتا ہو اور نہ ان کے خسارے پر راضی ہو، لیکن اس کے باوجود ایثار و فداکاری سے بھی کام نہ لیتا ہو۔

اسی طرح خوش بینی و خوش فہمی کو بھی حکمت کا جزو نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ خوش بینی اور تشخیص صحیح دو چیزیں ہیں۔

اس چار کی تقسیم پر اصرار کا سبب شاید قدمار کا طرز تفکر ہو جنھوں نے دُنیا کے اکثر موضوعات کو چار پر تقسیم کیا ہے اور عنصر اصلی بھی ان کے نزدیک چار تھے، بدن کے اجزار ترکیبی بھی چار اور مزاج کی بھی ان کے نزدیک چار قسمیں تھیں، جسمانی بیماریوں کے اصول کو بھی چار بیماریاں جانتے تھے اور تمام دواؤں میں چار میں سے کسی ایک طبیعت کے قائل تھے جبکہ آج یہ بات قطعی اور مسلم ہو چکی ہے کہ یہ ان کی تمام تقسیمیں غلط تھیں اسی طرح اخلاق نیک کی تقسیم بھی چار اصولوں پر درست نہیں ہے۔

۲۔ **حکمت**۔ حکمت کو فضائل اخلاقی کے اصول کا جزء اور اس کے نقطۂ مقابل کو جزء، رذائل اخلاقی شمار کرنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اخلاقی فضائل قوتِ تشخیص و

ادراک کے علاوہ ہیں اور ان کا تعلق نفسانی خواہشات او تقاضوں سے ہے نہ کہ تشخیص و ادراک سے۔ یہی وجہ ہے کہ خوش فکر ہونے کو حسنِ اخلاق سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

۳۔ قدمار کا یہ اصرار بھی بے دلیل ہے کہ تمام فضائل اخلاقی حد وسط ہیں افراط اور تفریط کی کیونکہ یہ بات بعض موارد پر صحیح ہے اور بعض کے لئے صحیح نہیں ہے۔

جیسا کہ حکمت کو فہم و تمیز کی حد وسط جاننا صحیح نہیں ہے کیونکہ عیاری و مکاری کثرت فہم اور ہوش کا نام نہیں ہے بلکہ عیّاری ایک طرح کی کمی فکر اور انحراف ذہنی و بے جا تشخیص کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح عدالت میں بھی زیادتی اور افراط کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں جسے انظلام یا تحمل ظلم کے نام سے تعبیر کیا جائے البتہ اگر تحمل ظلم کا مطلب سستی اور کاہلی ہے تو یہ عفت کے مقابلے میں قرار پائے گی اور اگر اثباتِ حق سے خوف مراد ہو تو قوت غضبانیہ کے تفریط کی منزل ہوگی۔ بہر حال عدالت میں افراط کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

اور خاص کر اس وقت جبکہ عدالت کی یوں تعریف کی گئی ہے کہ قوت غضبانیہ اور قوت شہوانیہ کے عقل کی پیروی کا نام عدالت ہے یہ بات قطعی ہے کہ اس کی پیروی میں افراط کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

اس تحقیق سے یہ نتیجہ نکلا کہ ملکات اخلاقی کا حد وسط ہونا بعض موارد جیسے شجاعت اور عفت کے لئے درست ہے لیکن اس قاعدے میں عمومیت نہیں ہے کیونکہ عدالت اور حکمت میں حد وسط کا تصور نہیں ہے (غور کیجئے)

اوپر کی بحث کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اچھے اور بُرے اخلاقی اصول کو صرف ۴ پر منحصر کر دینا نہ صرف بے دلیل ہے بلکہ کئی طرح سے قابلِ خدشہ ہے۔

لہذا حق یہ ہوگا کہ اصول فضائل اخلاقی کو چار پر منحصر نہ قرار دیں بلکہ ان کی تعداد اتنی ہی ہے جتنے انسان کے اندر غریزے، وجدان اور آرزوئیں ہیں، اور چونکہ انسان

مختلف اور بے شمار قدرتی صلاحیتوں کا مجموعہ ہے لہٰذا اس کے صفاتِ نیک و بد بھی اسی کے مطابق ہوں گے۔

ان قدرتی صلاحیتوں کی اگر اس طرح پرورش کی جائے کہ انسان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے لئے مفید اور تکامل کا باعث ہوں تو یہی صلاحیتیں فضیلت بن کر سامنے آتی ہیں اور اگر انھیں صلاحیتوں میں انحراف پیدا ہو جائے اور صحیح تربیت نہ ہو سکے تو یہی رذیلت بن کے ابھرتی ہیں۔

اس طرح صفات فضیلت و رذیلت کی تعداد انسان کے غرائز اور آرزوؤں کی تعداد کے مطابق ہوگی جس طرح جسمی بیماریوں کے اصول کی تعداد جسم کے مختلف شعبوں اور ان کے اجزاء ترکیبی کے برابر ہے۔

روایات و احادیث اہلبیت علیہم السلام میں بھی فضائل اخلاقی کی تعداد بہت زیادہ بیان کی گئی ہے جو چار کے عدد سے کافی زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر مشہور و معروف حدیث جو اصول کافی کے شروع میں امام جعفر صادق ؑ سے عقل و جہل کے لشکر کے بارے میں نقل ہوئی ہے اس میں ان دونوں کے لشکر کی تعداد پچھتر (۷۵) شمار کی گئی ہے جو اہم جزو ہیں فضائل و رذائلِ اخلاقی کے۔

معیارِ اخلاقِ نیک و بد

تمام اخلاقی مسائل واضح اور آشکار نہیں ہیں البتہ بعض مفاہیم جیسے شجاعت سخاوت اور فداکاری اس قدر روشن ہیں کہ کسی کو بھی ان کے فضیلت ہونے میں شک و شبہ نہیں ہے اور انھیں کے مقابلے میں بزدلی، بخیلی اور خودغرضی کا رذیلت اخلاقی ہونا بھی واضح ہے۔

لیکن ممکن ہے کہ بعض دوسرے مفاہیم فضیلت یا رذیلت ہونے میں موردِ بحث

قرار پائیں، لہٰذا بغیر کسی صحیح معیار و میزان کے اخلاقی مباحث روشن نہیں ہو سکتے۔

جیسے آج کل فلاسفۂ مادی مانند "برٹرنڈرسل" کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی فعل کے ارتکاب سے (کوئی بھی فعل ہو) دوسروں کو کوئی ضرر نہیں پہونچتا تو ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس فعل کو حرام و ناجائز قرار دیں، اور صرف اس گمان پر کہ فلاں مذہب قدیم "تابو" (مراد وہ محرمات ہیں جو بغیر دلیل بعض مذاہب یا پرانی رسموں کے تحت رائج ہیں) نے اسے قبیح جانا ہے، لہٰذا ناجائز ہے، صحیح نہیں ہے صرف اس فعل کے فوائد اور نقصانات کا حساب کرنا چاہیئے۔

——— (کتاب جہانی کہ من می شناسم ص۶۸)

یہ شخص مذکور اپنے اس عقیدے کی بنا پر بہت سے قبیح اعمال چونکہ دوسروں کے لئے مضر نہیں ہیں جائز جانتا ہے جیسے زنا وغیرہ جو طرفین کی رضامندی کے ساتھ ہو۔

بعض دوسرے مادّین جیسے کیونسٹ لوگ اس کے معتقد ہیں کہ بہت سے پُرانے اخلاقی اصول سرمایہ داری اور اقتصاد کی پیداوار تھے، لہٰذا سرمایہ داری کے ساتھ ہی وہ اصول بھی ختم ہو جائیں گے اس لئے ان لوگوں کے اخلاق کو صرف ان امور میں منحصر کر دیا ہے جو "پرولتاریا" مزدوروں کے انقلاب یا اس کی بقاء کے لئے مفید ثابت ہوں۔

بعض دوسری افواہیں بھی کچھ لوگوں کی طرف سے جو کسی مسلک کے پابند نہیں ہیں، بعض اخلاقی مسائل جیسے حیا اور عفت کے بارے میں سننے میں آتی ہیں جس کی بنا پر ہمارے لئے اس اخلاقی بحث میں روشن اور واضح معیار کا ہونا ضروری اور قطعی ہے۔

لہٰذا دیکھنا چاہیئے کہ ان موارد پر کون سا معیار ہے جس سے ہم تشخیص دے سکیں کہ کون سا عمل فضیلت اور مطابق اخلاق ہے اور کون سا فعل رذیلت اور بداخلاقی ہے؟

اگر ہم اس بحث کو دینی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ملاحظہ کریں تو اس سوال کا جواب بہت آسان ہے اور واضح ہے اور ہماری ذمہ داری بھی روشن ہے کیونکہ جب ہم نے

اسلام کی حقانیت کو قطعی دلیلوں کے ساتھ تسلیم کرلیا ہے تو فضائل اور رذائل اخلاقی کا معیار بھی ہمیں اسلام کے صحیح مدارک یعنی قرآن مجید اور سُنّت (روایاتِ صحیحہ) کے ذریعہ آسانی سے معلوم ہوجائے گا۔

لیکن اگر اس بحث کو عقلی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ایک قانون ہمیشہ نظر میں رکھنا پڑے گا وہ یہ کہ .... ہر وہ اصول اخلاقی جو انسان کو ترقی اور سعادت کی طرف لے جائے وہ فضیلت اور جو پستی اور ذلّت کا سبب بنے وہ رذیلت ہے۔

لیکن یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ انسان کا مطالعہ صرف اس کی مادّی ضروریات کے اعتبار سے کرنا اور اس کی معنوی اور روحانی احتیاجات کو جو اس کے لئے مایۂ افتخار و امتیاز ہیں، مدنظر نہ رکھنا بالکل غلط ہے، اس کی مادی زندگی وسیلہ اور زینہ ہے معنوی زندگی کا۔ لہٰذا اس کی معنوی ضروریات پر پوری توجّہ دینی چاہیئے۔

لہٰذا ممکن ہے کہ ایک بُرا اور قبیح عمل دوسروں کے لئے زحمت کا باعث نہ ہو لیکن انسانی اور معنوی اعتبار سے اس عمل کے انجام دینے والے کی پستی اور ذلّت کا سبب ہو یقیناً ایسا عمل رذیلت اور خلاف اخلاق ہوگا۔

جو لوگ انسان کو صرف مادی اعتبار سے دیکھتے ہیں انھوں نے انسان کے نصف وجود بلکہ اس سے بھی کم کی معرفت حاصل کی ہے حالانکہ اخلاقی اصول بغیر انسان کی پوری معرفت یعنی رُوح اور جسم دونوں کے مطالعے سے پہلے مرتب نہیں کئے جاسکتے۔

اور اس سے کہیں بدتر کمیونسٹوں کا اخلاق ہے جنھوں نے نہ صرف انسان کی معنوی حیثیت کو نظر انداز کردیا ہے بلکہ مادّی ضروریات کو بھی صرف ایک حصّہ (اقتصاد) پر منحصر کردیا ہے۔ یہ لوگ انسان کو صرف اس کی اقتصادی ضروریات کے اعتبار سے پیش کرتے ہیں۔

یہ بات بدیہی ہے کہ اس طرح کے اخلاقی مکاتب جو واقعیت سے دُور اور معرفتِ انسان سے خالی ہیں صحیح نتیجے تک نہیں پہونچ سکتے اور یقیناً ایسے لوگ فضائل و رذائل اخلاقی کی شناخت میں اشتباہ کا شکار ہوں گے۔

لہٰذا عقل و منطق کی روشنی میں اصول اخلاقی کو پہچاننے کا صحیح معیار وہی ہے جو ذکر کیا گیا یعنی انسان کی ترقی و سعادت کو تمام جہات سے مورد مطالعہ قرار دینا چاہیئے اور ان صفات کو جو ترقی اور سعادت کے لئے مفید ہیں ان سے جُدا قرار دینا چاہیئے جو مفید نہیں ہیں اور اسی کی روشنی میں فضائل و رذائلِ اخلاقی کی تحقیق کرنی چاہیئے۔

رہبانیت اور گوشہ نشینی کے اثرات اخلاق پر

تہذیبِ نفس اور اخلاقی فضائل کا حصُول سماج میں رہ کر زیادہ ممکن ہے یا گوشہ نشینی اور رہبانیت میں.؟

یہ وہ سوال ہے جسے بہت سے لوگ خود اپنے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انسان جتنا ہی زیادہ الگ تھلگ اور گوشہ نشین ہو اتنا ہی اخلاقی اعتبار سے بہتر اور سالم ہوگا، کیونکہ بہت سے انحرافات اور اخلاقی رذائل بلکہ اکثر روحانی بیماریاں اجتماع اور معاشرے کی بنا پر پیدا ہوجاتی ہیں جیسے حسد، تکبّر، جھوٹ، غیبت، بہتان، ریاکاری، کینہ پروری وغیرہ یہ سب ایسی اخلاقی بیماریاں ہیں جو بغیر دوسروں سے خلط ملط اور سماجی رہن سہن کے پیدا نہیں ہوسکتیں۔

جو شخص دوسروں سے بالکل الگ ہے، نہ کسی کی غیبت کرتا ہے اور نہ سُنتا ہے، نہ کسی سے حسد کرتا ہے اور نہ محسود واقع ہوتا ہے نہ ریاکاری کا شکار ہوتا ہے نہ دروغ گوئی سے کام لیتا ہے نہ کسی کا کینہ اس کے دل میں ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کے بارے میں بدگمانی پیدا کرتا ہے۔

حامیان گوشہ نشینی و رہبانیت جن میں بعض علماء اخلاق اور بہت سے مشہور زہاد و عباد بھی ہیں جو دلیل مذکور کے علاوہ دوسری دلیلیں بھی گوشہ نشینی کی فضیلت میں پیش کرتے ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ گوشہ نشینی بہتری اخلاق کے لئے کس قدر موثر ہے۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان تنہائی میں اچھی طرح خدا کی عبادت کر سکتا ہے اور حضور قلب کے ساتھ اس کی بارگاہ میں مناجات اور راز و نیاز کر سکتا ہے۔ **رموز** و اسرار خلقت کے بارے میں بہتر فکر کر سکتا ہے اور علوم کے مختلف شعبوں میں غور و فکر کر کے حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے، محبت و نفرت آپس کے جھگڑے اور اختلاف کو جنگ و جدال جو حقائق اور واقعیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں، تنہائی کی زندگی میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے بڑے بڑے مفکرین تنہائی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اس کے علاوہ معاشرہ میں زندگی بسر کرنا کبھی کبھی انسان کے لئے اہم ذمہ داری پیدا کر دیتا ہے جس میں کوتاہی انحراف کا باعث ہوتی ہے جیسا کہ معاشرے کے اندر اکثر و بیشتر برائیوں اور ارتکاب محرمات سے روبرو ہوتے ہیں جہاں پر امر بہ معروف اور نہی از منکر کے تحت واجب ہے کہ ان محرمات کے خلاف برسر پیکار رہوں، جبکہ ہم مطمئن نہیں ہیں کہ معاشرے میں رہ کر ہمیشہ اس وظیفہ کو انجام دے سکیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کریں تاکہ ان ذمہ داریوں سے نجات حاصل کر سکیں۔

ان دلیلوں کے علاوہ بہت سی آیات اور روایات میں بھی گوشہ نشینی کو ممدوح قرار دیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر ان میں سے بعض کی طرف قارئین کی توجہ کو مبذول کیا جاتا ہے:۔

(۱) فلما اعتزلھم وما یعبدون من دون اللہ وھبنا لہ
اسحٰق و یعقوب وکل جعلنا نبیاً

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور یعقوبؑ جیسے بیٹوں کی نعمت جو دونوں ہی نبی تھے اس وقت عطا ہوئی جبکہ گوشے اور تنہائی میں عبادت خدا میں مشغول تھے۔

(۲) واذا اعتزلتموھم وما یعبدون الا اللہ
فأووا الی الکھف ینشر لکم ربکم من رحمتہ

یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے کہ اصحاب کہف اجتماع سے علیحدگی اور گوشہ نشینی کی بنا پر لطف خداوندی کے مستحق بنے۔

(۳) قیل لرسول اللہ (ص) ای الناس افضل؟
قال مؤمن مجاھد بنفسہ وفی سبیل اللہ تعالیٰ
قیل ثم من؟ قال رجل معتزل فی شعب من
الشعاب یعبد ربہ و یدع الناس فی شرہ۔[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ تمام لوگوں میں سب سے افضل کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ صاحب ایمان شخص جو اپنے جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کرے۔ لوگوں نے عرض کی اس کے بعد کون ہے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص جو لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک گوشہ میں خدا کی عبادت کرتا ہو اور لوگ اس کے شر سے مامون ہوں۔"

اس روایت میں بھی گوشہ نشینی کو جہاد کے بعد درجہ دیا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے۔

---

[1] اس حدیث کے راوی ابوسعید خدری ہیں۔ احیاء العلوم کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ یہ روایت متفق علیہ ہے۔

(۴) کتاب مصباح الشریعۃ میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں :

صاحب العزلۃ متحصن بحصن اللہ ومحترس بحراستہ
فیا طوبیٰ لمن تفرد بہ سراً و علانیۃ

"گوشہ نشین قلعہ خداوندی اور حفاظت الٰہی میں ہے۔ تبریک ہے ان لوگوں کے لیے جو ظاہراً اور باطناً دونوں حال میں خدا کے ساتھ ہیں۔"

مضرات گوشہ نشینی اور رہبانیت

جو فوائد اور منافع گوشہ نشینی اور رہبانیت کے بارے میں اوپر ذکر کیے گئے ہیں اس کے نقصانات اور مفاسد اس سے کہیں زیادہ ہیں اور معاشرتی زندگی کے بے شمار فوائد اس کی ابتری کی دلیل ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے جو چیز اجتماعی زندگی کو روشن کرتی ہے وہ یہ کہ اکثر فضائل اخلاقی صرف اجتماع اور سماجی زندگی میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ انفرادی زندگی میں ممکن نہیں ہیں کیونکہ اکثر اخلاقی صفات دوسروں سے روابط کی بنا پر رونما ہوتے ہیں جیسے تواضع و انکساری ایثار و محبّت عفو اور درگزر، سخاوت اور بردباری، رحم دلی اور ماتحت نفس پر تسلط اور غصہ پر قابو رکھنا وغیرہ ایسے اخلاقی صفات ہیں جو لوگوں کے ساتھ رہن سہن اور ربط و ضبط سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان صفات کا حصول اجتماعی زندگی کے بغیر ناممکن ہے۔

ثانیاً گوشہ نشین رہ کر بعض اخلاقی مفاسد جیسے حسد، تکبّر، جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے محفوظ رہنا حقیقت میں فضیلت یا افتخار نہیں ہے بلکہ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کوئی انسان بے عفتی سے بچنے کے لیے اپنے کو اس وسیلے سے ہی محروم کر لے۔ یقیناً ایسا شخص آلودگی سے محفوظ رہے گا، لیکن اس طرح کی پاکدامنی فضیلت شمار

نہیں کی جاتی۔ فضیلت اور کمال تو یہ ہے کہ انسان معاشرہ کے اندر رہ کر آلودگیوں کے درمیان سے حضرت یوسفؑ کی طرح گزر جائے اور اپنے دامن کو داغدار نہ ہونے دے ہاں خود سے عمداً ایسا ماحول پیدا نہ کرے۔

لہٰذا اخلاق فاضلہ جو انسان کے امتیاز و شرف کا معیار ہیں ان کے حصول کی صرف ایک ہی راہ ہے کہ ہم سماج اور معاشرہ میں زندگی گزاریں اور سماج کے لوگوں سے ارتباط رکھیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ صفاتِ عالیہ خواہشاتِ نفس اور اسبابِ فساد سے مقابلے اور ان پر غلبے کے بعد حاصل ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح جنگلی اور صحرائی درختوں کی لکڑیاں کافی محکم اور پائیدار ہوتی ہیں کیونکہ وہ سخت سے سخت طوفانی ہواؤں کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ اگر وہی درخت کسی محدود اور بند جگہ پر پرورش پائیں تو ان میں وہ استحکام اور مضبوطی نہیں ہوتی۔ اسی طرح گوشہ نشین اور معاشرہ سے الگ زندگی گزارنے والے لوگ بھی دھیرے دھیرے اپنے روحانی کمالات اور انقلابی جوہر سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں۔

اور شاید یہ حدیثِ ذیل اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے :—

پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں مسلمانوں میں سے ایک شخص عبادت کی غرض سے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک پہاڑ کے اوپر مقیم ہو گیا تھا۔ اس کو رسولؐ خدا کے پاس لا یا گیا۔ حضرتؐ نے اس سے فرمایا :-

لا تفعل انت ولا احد منکم لصبر احدکم فی
بعض مواطن الاسلام خیر من عبادۃ احدکم
اربعین عاماً۔

" نہ تم نہ کوئی ایک مسلمان ہرگز ایسا نہ کرنا کیونکہ مسلم سماج میں صبر و

استقامت کے ساتھ زندگی گزارنا چالیس سال کی عبادت سے بہتر ہے۔" (المحجۃ البیضاء جلد ۴ ص ۸)

اس گفتگو سے حامیان گوشہ نشینی کی پہلی دلیل کا جواب روشن ہو جاتا ہے۔

۲۔ تنہائی اور گوشہ نشینی بہت سے فکری انحرافات اور اشتباہات کا سرچشمہ ہے کیونکہ انسان جس قدر بھی خوش فکر اور پُر استعداد ہو، اشتباہات سے مبرا نہیں ہو سکتا اور یہ اشتباہات بغیر دوسروں سے ربط و ضبط کے آشکار نہیں ہوتے۔ معاشرہ میں رہ کر انسان بہت جلد اپنے اشتباہات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے لیکن تنہائی اور گوشہ نشینی میں چوں کہ ان کے اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے لہذا انسان ہمیشہ اسی منحرف راستے پر باقی رہتا ہے، اس شخص کی طرح جو صحیح راستے کو گم کر کے غلط راستہ پر گامزن ہو، یہ شخص جتنا بھی آگے بڑھتا جائے گا، اتنا ہی زیادہ اصلی راستے سے دُور ہوتا جائے گا اور کبھی کبھی اسی انحرافی اور غلط فکر کو دوسرے مطالب کے لئے مدرک قرار دیتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کا ذہن اشتباہات کی آماجگاہ بن کے رہ جاتا ہے اور اس کے افکار بے قیمت ہو کے رہ جاتے ہیں۔

اس بیان کے ضمن میں حامیانِ گوشہ نشینی کی دوسری دلیل (یعنی تنہائی میں انسان بہتر فکر کر سکتا ہے) کا جواب بھی روشن ہو جاتا ہے کیونکہ تنہائی افکارِ انسانی کے لئے کافی خطرناک ہے۔

۳۔ گوشہ نشینی کا ایک دوسرا عیب خود پسندی اور یہ غریزہ حبِّ ذات کی دین ہے جو ایک فطری شئے ہے جس کی بنا پر انسان اپنی ذات اور اپنے افکار و اعمال کے لیے ضرورت سے زیادہ اہمیت کا قائل ہوتا ہے۔

تقاضۂ حبِّ ذات دراصل خورد بین کے مانند ہے جو انسان کے افکار و اعمال کو بڑھا چڑھا کے پیش کرتی ہے اور اس کی بُرائیوں کو چھوٹا بنا کے پیش کرتی ہے

یہی دونوں چیزیں انسان کی خود پسندی اور خود بینی کا سبب قرار پاتی ہیں۔ تنہائی اور گوشہ نشینی اس صنف رذیلہ کی پرورش کے لئے کافی مددگار ثابت ہوتی ہے، لیکن معاشرہ میں زندگی بسر کرنے والا انسان دوسروں سے ربط و ضبط کی بنا پر اپنی حقیقت کو پہچان لیتا ہے اور اپنے فضائل و کمالات کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے اور اس طرح صفت خود پسندی آہستہ آہستہ اس سے دُور ہو جاتی ہے

یہی وجہ ہے کہ اکثر گوشہ نشین افراد بہت بڑے بڑے اور عجیب و غریب دعوے کرتے نظر آتے ہیں جس کا سبب خود پسندی اور خود بینی ہے۔

اس بیان سے معاشرتی زندگی کا ایک اور اہم فائدہ بھی واضح ہو جاتا ہے، وہ اپنے عیوب کی تشخیص ہے۔ خاص کر وہ لوگ جن سے ہمارے دوستانہ تعلقات نہیں ہیں، یا جو دشمن ہیں، ایسے لوگ ہمارے عیوب کی تشخیص کے لئے آئینہ کا بہترین کام انجام دیتے ہیں، اگر ایسے لوگ نہ ہوں تو ہماری بہت سی برائیاں ہمیشہ کے لئے ہم پر مخفی رہ جائیں۔ ہم گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر کے اس مفید ترین آئینہ کو توڑ دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں ہمارا چہرۂ روحانی بھی ان لوگوں کے بے ڈھنگے چہرے کے مانند ہو جاتا ہے جو کبھی آئینہ کی طرف نگاہ نہیں کرتے۔

خدا کے بندوں سے بدگمانی

۴۔ گوشہ نشینی کے عیوب میں سے ایک بدگمانی بھی ہے اور یہ بھی نتیجہ ہے خود پسندی اور خود بینی کا کیونکہ انسان جب شدید خود بینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے بارے میں حد سے زیادہ خوش عقیدہ ہو جاتا ہے اور لوگوں سے جس قدردانی اور احترام کا امیدوار ہوتا ہے وہ حاصل نہ ہونے پر لوگوں سے کافی بدظن ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ تمام لوگ بدنیت، فضیلت کش اور خود غرض ہیں انھیں اچھے برے کی

کوئی تمیز نہیں ہے بلکہ تمام لوگ گمراہ اور منحرف ہیں، اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی معاشرت اختیار کی جائے۔ اس طرح گوشہ نشینی خود سبب بنتی ہے گوشہ نشینی کی تقویت کا اور ایسے لوگوں کو مزید گوشہ نشین بنا دیتی ہے۔

۵۔ غیظ و غضب اور کج خُلقی: گوشہ نشین افراد عام طور سے غصہ ور اور بد اخلاق ہوتے ہیں اور کسی طرح کی معمولی سی زیادتی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ذرا ذرا سی باتوں پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر پاتے۔

اس کے برعکس وہ لوگ جو معاشرہ میں زندگی بسر کرتے ہیں، کافی جفاکش اور باحوصلہ ہوتے ہیں، ان کے چہرے ہشاش بشاش اور عام طور سے خوش اخلاق ہوتے ہیں اور ان کا باحوصلہ ہونا بھی واضح ہے کیونکہ وہ معاشرہ میں رہ کر سختیوں اور مشکلات کو جھیلنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور یہ ممارست انھیں آہستہ آہستہ باحوصلہ بنا دیتی ہے۔

لیکن گوشہ نشین لوگ زیادہ تر خشک مزاج ہوتے ہیں، بہت کم ہنستے ہیں اور بہت کم مذاق کرتے ہیں بلکہ ان کی زندگی میں مسلسل خستگی ہی خستگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے روحانی اعتدال کو کھو بیٹھتے ہیں، جس کی بنا پر انھیں رُوحانی سکون حاصل نہیں ہو پاتا۔ اور جو بدگمانی ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے چونکہ اس کے دُور کرنے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہوتا لہٰذا اسی قلبی الجھن اور بیماری میں مبتلا رہتے ہیں اور یہ حالات ان کی کج خلقی اور غیظ و غضب میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

۶۔ علوم اور تجربات سے محرُومیت: بہت سے علوم و افکار ایسے ہیں جو بزرگوں کی زبان روش اور طرز تفکر کو دیکھ کر حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ علوم بغیر معاشرتی زندگی اختیار کیے نہیں حاصل ہو سکتے۔ اس کے علاوہ افکار میں پختگی اور قسم قسم کے تجربے گوشہ نشین رہ کر نہیں حاصل ہو سکتے بلکہ اس کا واحد راستہ سماجی

رہن سہن ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ زندگی کا ماحصل مفید اور نفع بخش تجربوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

* * *

لیکن اس مقام پر ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے وہ یہ کہ باوجود اسکے کہ ہر انسانی زندگی کی بنیاد معاشرت اور باہمی ربط و ضبط پر ہونی چاہیئے۔ کچھ استثنائی موارد بھی ہیں جہاں گوشہ نشینی اور قطع ارتباط کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ جیسے کوئی انسان ایسے فاسد ماحول میں ہو جہاں انحراف اور گمراہی کے علاوہ کوئی توقع نہ پائی جاتی ہو، ایسے معاشرہ سے دُوری لازمی ہے تاکہ انسان آلودگی سے محفوظ رہ سکے بالکل اسی طرح جیسے ان مقامات سے اجتناب کیا جاتا ہے جہاں چھوت کی بیماریاں پھیلی ہوئی ہوں۔

حضرت ابراہیم ؑ یا اصحاب کہف وغیرہ کی گوشہ نشینی اسی قسم سے تھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے سفیان ثوری سے ارشاد فرمایا:۔

فسد الزمان و تغیر الاخوان فرأیت الانفراد اسکن للفواد۔

"زمانہ فاسد ہو گیا، احباب منقلب ہو گئے، ایسی صورت میں گوشہ نشینی کو میں نے زیادہ سکون بخش پایا۔"

اس روایت میں اسی کی طرف اشارہ ہے[1]۔ اس بحث سے حامیان گوشہ نشینی کی اکثر دلیلوں کا جواب بھی روشن ہو جاتا ہے۔

اسی طرح وہ شخص جو بد خلقی کی اس منزل پر پہونچ چکا ہو کہ اسے ترک کرنا اس کے لئے محال ہو، اسے معاشرہ سے الگ ہو کر تنہائی کی زندگی گزارنا چاہیئے تاکہ پورا معاشرہ اس برائی

---

[1] سفینۃ البحار مادہ عزل

میں ملوث نہ ہو۔ حدیث میں بھی " رجل معتزل فی شعب من الشعاب "
سے اسی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر حامیان گوشہ نشینی کی دلیلوں کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

ایک اور نکتہ جس کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ اجتماعی اور معاشرتی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر روز اپنے اوقات کا ایک حصہ تنہائی میں گزارا جائے، تاکہ اچھی طرح غور و فکر اور مطالعہ کر سکے اور فراغت کے ساتھ بارگاہ معبود میں راز و نیاز اور بندگی کے فرائض خلوص کے ساتھ انجام دے سکے تاکہ شکوک و شبہات اور ریاکاری سے محفوظ رہے جیسا کہ اکثر بزرگوں کا شیوہ بھی یہی تھا کہ وہ اپنے روزمرہ کے اوقات کا ایک حصہ غور و فکر، مطالعہ اور عبادت کے لئے مخصوص قرار دیتے تھے، ممکن ہے کہ روایات عزلت اور گوشہ نشینی سے اسی امر کی طرف اشارہ ہو۔

لہذا اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی زندگی کی اصل و اساس معاشرت اور باہمی زندگی پر ہے اور تنہائی و گوشہ نشینی خاص موارد کے لئے ہے۔

مراقبہ اور محاسبہ

علماء اخلاق نے اپنی کتابوں میں اخلاقِ فاضلہ کے حصول اور رذائل سے بچنے کے لئے دو چیزوں کو لازمی اور ضروری قرار دیا ہے جس کے بغیر روحانی و اخلاقی مراتب کمال تک پہنچنا ناممکن ہے۔

(۱) **مراقبت**۔ یعنی کوئی فعل انجام دینے سے پہلے اس کی ماہیت کے بارے میں پوری توجہ اور غور و فکر۔

(۲) **محاسبہ** یعنی جو فعل انجام دیا جا چکا ہے اس کے آثار و نتائج کے بارے میں تحقیق۔

اکثر و بیشتر ان دونوں مرحلوں کی معمولی سی غفلت انسان کو اس بدبختی کے گھاٹ

اُتار دیتی ہے جس سے واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔

انسان کی روح کی حالت بھی بالکل اس کے جسم کے مانند ہے جس طرح سلامتیِ جسم کے لئے انسان بہت سے طبی اور ڈاکٹری اصولوں کی رعایت پر مجبور ہوتا ہے اور کوئی غذا کھانے سے پہلے، کسی نئی جگہ جانے سے پہلے اسے دیکھنا پڑتا ہے کہ اس میں کسی بیماری کا خطرہ تو نہیں، اور کبھی کبھی اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ بیماری سے سے بچنے کے لئے مختلف طرح کے ٹیکے وغیرہ لگوائے، کھانے پینے کی بعض چیزوں سے پرہیز کرے بلکہ کبھی مجرب ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جا کر اپنا معائنہ بھی کرانا ہوتا ہے اور بیماری کے معالجہ کے بعد بھی مدتوں کمزوری اور نقاہت کو دور کرنے کے لئے مقویات استعمال کرنی ہوتی ہیں، تاکہ جسم کی کھوئی ہوئی قوت کو پھر سے واپس لایا جا سکے۔

سلامتیِ روح اور اخلاقی بیماریوں سے بچنے کے لئے بھی ان تمام امور کی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ جو شخص بھی یہ چاہتا ہے کہ اخلاق کی اعلیٰ منزلوں پر فائز ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل چند امور کا لحاظ ضروری ہوگا:

(۱) ہمیشہ اپنے حالات پر نگرانی رکھے، اس توجہ کے ساتھ کہ اس سے پہلے خدا اس کے تمام حالات پر نگراں اور نظارت رکھنے والا ہے ـــ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:ـــ

افمن ھو قائم علیٰ کل نفس بما کسبت

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم انسان کے تمام حالات پر اسی طرح نظارت رکھتا ہے جیسے کوئی اس کے سر پر بیٹھ کر اس کی نگرانی کرے۔[1]

---

[1] سورہ رعد آیۃ ۳۵

اسی طرح دوسری آیہ کریمہ میں ہے :۔۔۔

ان اللہ کان علیکم رقیبا[1]

"خدا تمہارے اعمال پر نگراں ہے۔"

اور حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :۔۔۔

اعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔

"اس طرح عبادتِ خدا بجالاؤ جیسے اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ بہر حال تمھیں دیکھ رہا ہے۔"

اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ حدیث وارد ہوئی ہے تفسیر میں لفظ احسان کی آیہ مبارکہ ۔۔۔ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ۔۔۔ کے ضمن میں یعنی تمام نیکیوں کا سرچشمہ بھی مراقبت اور نظارت ہے۔

(۲) دوسرے ہر گفتگو اور کام سے پہلے اس کی عاقبت اور نتیجہ کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کرنا چاہئے کیونکہ روایت میں ہے :۔۔۔

انہ ینشر للعبد فی کل حرکۃ من حرکاتہ وان صغرت ثلثۃ دواوین الاول لم الثانی کیف الثالث لمن۔

"ہر عمل انجام دیتے وقت چاہے وہ عمل جتنا ہی معمولی ہو، تین رجسٹر ان کی خصوصیات کو ثبت کرنے کے لئے کھولے جاتے ہیں، پہلے رجسٹر میں اس کے انجام دینے کا سبب (یعنی کیوں انجام دیا گیا) اور دوسرے

[1] سورہ نساء آیۃ ۱

میں اس کی کیفیت، یعنی کس طرح انجام پایا، اور تیسرے میں کس کے لئے انجام دیا گیا۔"[1]

یعنی پہلے میں فوائد عمل، دوسرے میں کیفیت عمل اور تیسرے میں اس عمل کا ہدف اور مقصد واقعی درج کیا جاتا ہے۔

ان حقائق کی طرف توجہ یقیناً انسان کو بُرے کاموں سے روک سکتی ہے۔

۳۔ ہر روز جتنے کام بھی انجام دے اس کا اچھی طرح محاسبہ کرے تاکہ اگر کوئی گناہ یا لغزش ہو گئی ہو اس کی طرف پہلے ہی مرحلے میں متوجہ ہو جائے اور وہ گناہ اپنی جڑیں مضبوط نہ کر سکے اور ایک حالت روحانی نہ پیدا کر سکے، جس قدر جلد ممکن ہو، اس کے اثرات کو اپنی روح و دل سے دُور کرنے کی کوشش کرے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے خطرناک نتائج کو سوچ کر اپنے کو ملامت کرے اور آئندہ اس سے مقابلے کے لئے اچھی طرح تیار اور مصمم ہو جائے اور جتنا گناہ اس سے سرزد ہو چکا ہے اتنی ہی نیکیاں بجالائے تاکہ اس کی گئی ہوئی نورانیت اور صفائے قلب اپنی پہلی حالت پر واپس آسکے، بالکل اس شخص کی طرح جو جسمانی بیماری سے اُٹھنے کے بعد تقویت جسم کا اہتمام کرتا ہے چنانچہ اسے بھی اپنے ایمان اور روح کی تقویت کے لئے ایک مُدت تک کوشاں رہنا چاہئے۔ اور توبہ استغفار کا مفہوم بھی دراصل یہی ہے۔

یہ موضوع یعنی محاسبہ اور جبران عمل اس قدر ضروری اور اہم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔۔۔

انی لاستغفر اللہ واتوب الیہ فی الیوم

[1] احیاء العلوم و محجۃ البیضاء

ماۃ مرۃ۔"

"میں ہر روز اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سّو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔"

جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ آپؐ کا استغفار گناہ کی وجہ سے نہیں بلکہ کیفیت اطاعت کی بنا پر ہے۔!

۳

تہذیب اخلاق کی راہ میں
پہلا قدم

اصلاحِ زبان و بیان

- زبان دِل کی ترجمان اور شخصیت کا راز ہے۔
- زبان تیس اہم گناہوں کا سرچشمہ
- خاموشی اور سکوت

اِصلاحِ زبان و بیان

زبان دل کی ترجمان اور شخصیت کا راز ہے

زبان و بیان کی اصلاح کو اخلاقی مباحث میں اس لئے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ زبان ہی دل کی ترجمان اور عقل کی پیامبر ہے۔ زبان انسان کی شخصیت کا راز اور روحِ انسانی کے لئے اہم ترین روشن دان کی مانند ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جو کچھ انسان کے صفحہ روح پر نقش ہوتا ہے (چاہے اس کا تعلق علوم و افکار سے ہو یا جذبات و احساسات سے) سب سے پہلے زبان ہی پر اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر اطبائے قدیم مزاج کے اعتدال و انحراف کا اہم سبب زبان کی کیفیتوں کو قرار دیتے تھے تو آج کے ماہرین بھی قلبی مسائل کی حقیقت ان کے بیانات اور اقوال میں تلاش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ علمائے اخلاق اصلاح زبان کے بارے میں خاص اہمیت کے قائل ہیں اور زبان کی اصلاح کو روح اور فضائل اخلاقی کے تکامل اور ارتقاء کا سبب مانتے ہیں۔

اہلبیت علیہم السّلام کی حدیثوں میں بھی مختصراً اس امر کی طرف اشارہ موجود ہے جیسا کہ حضرت علیؑ اور امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے:۔

(۱) المرء مخبوءٌ تحت لسانہ: "انسان اپنی زبان کے

نیچے پوشیدہ ہے۔"! یعنی اس کی صرف علمی حیثیت ہی نہیں بلکہ اخلاقی و سماجی حالات بھی اس کی زبان ہی سے آشکار ہوتے ہیں[1]

۲۔ لا یستقیم ایمان امرء حتی یستقیم قلبہ ولا یستقیم قلبہ حتی یستقیم لسانہ

"ایمان اس وقت تک پائیدار نہیں ہوتا جب تک دل میں پختگی نہ پیدا ہو اور دل اس وقت تک پختہ نہیں ہوتا، جب تک زبان میں استقامت نہ پائی جائے۔"[2]

اصلاح زبان کی اہمیت ہمارے لئے خود بخود روشن ہوجائے گی جب ہم جان لیں گے کہ بہت سے بڑے بڑے گناہ زبان ہی سے سرزد ہوتے ہیں، جس طرح مرحوم فیضؒ نے کتاب محجۃ البیضاء میں اور غزالی نے احیاء العلوم میں زبان کے گناہوں کے سلسلے میں مفصل بحث کی ہے اور غزالی نے **بیس گناہان** زبان سے متعلق شمار کرائے ہیں، جس کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ ایسے موضوعات پر گفتگو کرنا جس کا اس سے کوئی ربط نہ ہو
۲۔ بیہودہ باتیں اور بکواس کرنا
۳۔ حرام اور غلیظ چیزوں کی تعریف کرنا جیسے شراب، جوئے اور بازاری عورتوں کی تعریفیں۔
۴۔ فضول بحث و مباحثہ اور دوسروں پر اعتراض و نکتہ چینی محض مقابل کو نیچا دکھانے یا اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے۔

---

[1] کلمات قصار امیر مومنانؑ
[2] احیاء العلوم

۵۔ بحث و مباحثہ کے درمیان جھگڑا اور کٹ حجتی کرنا۔
۶۔ لفاظی و قافیہ آرائی بے معنی
۷۔ بدتمیزی اور سب و شتم
۸۔ (بے جا) لعنت و ملامت
۹۔ گانے اور فاسد اشعار
۱۰۔ حد سے زیادہ ہنسی مذاق
۱۱۔ کسی کا مذاق اُڑانا
۱۲۔ دوسروں کے راز کو فاش کرنا
۱۳۔ جھوٹا وعدہ کرنا
۱۴۔ جھوٹ بولنا اور قسم
۱۵۔ غیبت کرنا
۱۶۔ لوگوں پر نکتہ چینی کرنا
۱۷۔ منافقت اور دوروئی سے کام لینا
۱۸۔ جھوٹی تعریف کرنا
۱۹۔ گفتگو اور بیان کے وقت معمولی غلطیوں سے غفلت
۲۰۔ عوام کا پیچیدہ عقائد کے بارے میں سوال کرنا جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ غزالی نے یہ جو چند اشتباہات اور انحراف شمار کرائے ہیں زبان کے متعلق ان اہم برائیوں کو، نظر رکھا ہوگا، ورنہ زبان کے عیوب اور بھی بہت سے ہیں جن کا ذکر اس میں نہیں ہے۔ جیسے یہ امور مذکورہ بھی زبان و بیان ہی سے متعلق ہیں، ملاحظہ فرمائیں:۔

١. تہمت لگانا
٢. جھوٹی گواہی دینا
٣. اپنی تعریف کرنا
٤. برائیوں اور جھوٹی و بے اساس باتوں کا پروپیگنڈہ کرنا
٥. گفتگو میں غصہ اور تندی سے کام لینا۔
٦. مہمل اصرار کرنا (جیسا بنی اسرائیل کرتے تھے)
٧. گفتگو سے دوسروں کو اذیت پہونچانا۔
٨. ناحق کسی کی مذمت کرنا
٩. زبان سے کفران نعمت اور ناشکری کرنا
١٠. باطل کی ترویج اور گناہ کی طرف تشویق کرنا

اس کے بعد بھی زبان کے سارے گناہ انھیں پر منحصر نہیں ہیں، اس سے زبان کی اہمیت بخوبی واضح ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ گناہ جو ذکر کئے گئے ہیں بعض کو دوسرے بعض گناہوں کے تحت حساب کیا جائے، مثلاً جھوٹے وعدے اور جھوٹی گواہی کو مطلقاً جھوٹ کے تحت رکھا جائے۔ اسی طرح بعض گناہ ایسے ذکر کیے گئے ہیں جو زبان سے مختص نہیں ہیں جیسے غیبت یا ایذا مومن، کفران نعمت وغیرہ جو زبان اور غیر زبان دونوں ہی سے مربوط ہیں۔

لیکن جو بات یقینی ہے وہ یہ کہ مسئلہ زبان کی اصلاح اخلاقی مسائل میں انتہائی اہم درجہ رکھتی ہے لہٰذا اسے زیادہ مورد مطالعہ و بحث قرار دینا چاہیے۔

اس موضوع کی اہمیت اس وقت اور بھی روشن نظر آتی ہے جبکہ ہم اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو جائیں کہ زبان انسان کے پاس بہت آسان اور بہت ہی

سادہ و سستا وسیلہ و سرمایہ ہے جو اس کے اختیار میں ہے اور اس کی سرعت عمل کا کسی چیز سے مقائسہ نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا چاہئے کہ اچھی طرح اس سے باخبر رہے یہاں پر اگر زبان کو ایٹم بم سے تشبیہ دی جائے جو کہ کافی قوت رکھنے کے ساتھ ساتھ بہت جلد پھٹ جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے تو یہ تشبیہ بہت مناسب ہوگی کیونکہ زبان کا حال بھی تقریباً ایسا ہی ہے لہٰذا انسان کو چاہئے کہ جس طرح ایٹم بم جیسی مہلک چیزوں سے ہوشیار رہتا ہے اسی طرح اس حساس عضو سے بھی ہوشیار رہے۔

خاموشی اور سکوت

انسان کے لئے ضروری ہے کہ ان خطروں کی طرف متوجہ رہے جو زبان کو آزاد رکھنے کی بنا پر پیدا ہو سکتے ہیں۔ علماء اخلاق نے خاموشی کو خطروں سے بچنے کے اسباب میں سے شمار کیا ہے، ان موارد کے لئے جہاں گفتگو کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ اور اس کے متعلق بہت سی روایات پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام سے وارد ہوئی ہیں جس سے سکوت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اسی وجہ سے بعض علماء اخلاق نے موضوع اخلاق کو اسی بحث سے شروع کیا ہے۔ اس کے علاوہ سکوت خود انسان کو ایک حالت تفکر و روحانیت اور روشن فکری عطا کرتا ہے جو خود قابل توجہ ہے۔

شاید یہی وجہ ہو کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے حالات میں ہے کہ جب آپ نے مسلسل تین روز تک سکوت اختیار فرمایا اس وقت آپ کو بیٹے کی بشارت دی گئی اور ان کی دعا مستجاب ہوئی۔

قال آیتك ان لا تكلم الناس ثلاث
لیال سویا (مریم - ١٠)

ارشاد ہوا کہ اس کی علامت یہ ہے کہ تم تین رات تک کسی سے بات نہیں کروگے

اور جناب مریمؑ کو خاموشی کا روزہ رکھنے کا حکم ہوا۔

فقولی انی نذرت للرحمٰن صوما فلن اکلم
الیوم انسیا (مریم آیۃ ۲۶)

"کہہ دیجئے کہ میں نے نذر کی ہے کہ خدا کے لئے روزہ رکھوں لہٰذا میں آج کسی سے نہیں بولوں گی۔"

پیغمبر اکرمؐ کے حالات میں بھی ملتا ہے کہ آپ نزول وحی سے قبل مسلسل کئی دن تک غار حرا میں جاکر سکوت اور تفکر کے عالم میں رہا کرتے تھے، اور رموز خلقت کے بارے میں محو مطالعہ رہتے تھے۔

سکوت کے فوائد بطور خلاصہ ان چند امور میں ذکر کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ سکوت انسان کو بہت سے گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے جس کی وضاحت پیغمبر اکرمؐ نے دو لفظوں میں یوں فرمائی ہے:

"من صمت نجا (جس نے سکوت اختیار کیا نجات پائی) ۱؎

اس کا سبب بھی واضح ہے کیونکہ اکثر گناہ زبان ہی سے سرزد ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد ختمی مرتبتؐ ہے:

"اکثر خطایا ابن آدم فی اللسان" (انسان کے اکثر اشتباہات کا سرچشمہ زبان ہے) ۲؎

اور تیسری حدیث میں یوں ارشاد ہورہا ہے:۔

"اخزن لسانك الا من الخیر فانك بذلك تغلب الشیطان" ۳؎

۱؎ ۲؎ ۳؎ محجۃ البیضاء جلد ۵

"اپنی زبان کو نیک باتوں کے علاوہ محفوظ رکھو، کیونکہ اس کی وجہ سے تم شیطان پر غالب ہوسکتے ہو۔"

۲۔ سکوت اور خاموشی انسان کو غور و فکر کی طرف دعوت دیتی ہے جس میں انسان کی معنوی زندگی کی ارتقاء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاموش لوگ عام طور سے مفکر با استعداد اور باعمل ہوتے ہیں برخلاف ان لوگوں کے جو بہت زیادہ باتیں کرتے ہیں جن کی اکثریت بے استعداد اور بے عمل ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام سے مروی ہے:۔

اذا رایتم المؤمن صموتاً وقوراً فادنوا منہ فانہ یلقن الحکمۃ ۱؎

"جس وقت کسی مومن کو ساکت اور باوقار دیکھو اس کی قربت اختیار کرو وہ تمھیں حکمت کی تعلیم دے گا۔"

اور حضرت علیؑ سے منقول ہے:۔

اذا تم العقل نقص الکلام ۲؎

"جب عقل کامل ہوجاتی ہے تو باتیں کم ہوجاتی ہیں۔"

ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ گفتگو کے وقت کلام کرنے والے کی زیادہ تر قوت فکر صرف ہوجاتی ہے۔ اگر یہی فکری صلاحیتیں ذخیرہ ہوتی رہیں، تو ایک عظیم فکری سرمایہ اکٹھا ہوسکتا ہے اور اس کے ذریعے بڑے اور اہم حقائق رونما ہوسکتے ہیں۔ اس کے باوجود سکوت خود اطمینان روح اور جذبات و احساسات

۱؎ المحجۃ البیضاء جلد ۵

۲؎ نہج البلاغہ کلمات قصار

کے معتدل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

۳۔ سکوت کے برعکس زیادہ باتیں کرنا انسان کو لاابالی بنا دیتا ہے کیونکہ اس سے انسان کی لغزشیں بڑھتی ہیں اور اس کی حیا کم ہوجاتی ہے۔ اور جب حیا کا پردہ چاک ہوجاتا ہے تو گناہ کی اہمیت اس کی نظروں میں کم ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:۔

من کثر کلامه کثر خطائه ومن کثر خطائه قل حیائه ومن قل حیائه قل ورعه ومن قل ورعه مات قلبه ومن مات قلبه دخل النار [1]

"جو زیادہ باتیں کرتا ہے اس کی خطائیں زیادہ ہوتی ہیں اور جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کی حیا کم ہوجاتی ہے اور جس کی حیا کم ہوتی ہے اس سے خوف خدا کم ہوجاتا ہے اور جس کا زہد و تقویٰ کم ہوجاتا ہے اس کا دل مُردہ ہوجاتا ہے اور جس کا دل مردہ ہوجاتا ہے وہ دوزخ کا مستحق ہوجاتا ہے۔"

شاید اسی وجہ سے سکوت کو اہم ترین عبادات سے شمار کیا گیا ہے:۔

العبادة عشرة اجزاء تسعة منها فی الصمت

"عبادت کے دس حصے ہیں جس کے نو حصے سکوت میں ہیں"

لیکن یہ بات یہاں پر قابل توجہ ہے کہ سکوت گوشہ نشینی کے مانند نہیں ہے جس کا مقصد محل گناہ سے دُوری ہو بلکہ سکوت خود گناہ سے بچنے کا نام ہے اور ان مقامات پر

[1] نہج البلاغہ کلمات خصار

جہاں انسان غیبت اور جھوٹ وغیرہ کی طرف مائل ہوجاتا ہے اگر وہاں پر سکوت اختیار کرے تو علاوہ ان گناہوں سے بچنے کے ایک فضیلت کا مالک ہو سکتا ہے۔

اور یہ بات بھی مخفی نہ رہے کہ ایسے مقامات جہاں پر بولنا ضروری ہے سکوت کو گناہ اور بدترین عیب شمار کیا گیا ہے اور اسے علامت بزدلی ناتوانی ضعفِ رُوح اور غیر خدا سے ڈرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ جس طرح بہت سے گناہ زبان ہی سے سرزد ہوتے ہیں۔ بہت سی نیکیاں اور اہم عبادات بھی زبان ہی کے ذریعے انجام پاتی ہیں جیسے نماز اور ذکر خدا تعلیم و تربیت وعظ و نصیحت لوگوں کی ہدایت وغیرہ زبان ہی کی مرہونِ منت ہے۔

۴

سچائی

شرافت کی روشن ترین علامت

- سچائی کے اعجاز نما آثار
- جھوٹ گناہوں کی کنجی
- جھوٹ اور ایمان میں تضاد
- جھوٹ انسان کو لاابالی بنا دیتا ہے
- جھوٹا انسان اپنے اوپر بھی اعتماد نہیں رکھتا
- جھوٹ کا سرچشمہ
- جھوٹ سے بچنے کے ذرائع
- جھوٹ کے مستثنیٰ موارد
- توریہ کیا ہے؟
- کیا توریہ جھوٹ نہیں ہے؟ اور مستثنیٰ موارد پر اس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے؟
- توریہ کی نئی تفسیر

سچّائی
شرافت کی روشن ترین علامت

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دو صفتیں سچّائی اور امانت داری شرافت کی واضح ترین نشانیاں ہیں بلکہ ان دو صفتوں کے بغیر کسی کو انسان کہنا بھی صحیح نہ ہوگا، اور یہ دونوں اصل میں ایک درخت کی دو شاخوں کی مانند ہیں کیونکہ سچّائی نام ہے زبان کی امانت داری کا اور امانت داری نام ہے عمل کی صداقت کا، اور ان دونوں کے اجتماعی آثار بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، جیساکہ آنے والی بحثوں سے واضح ہو جائے گا۔

اور شاید اسی وجہ سے رہبران اسلام علیہم السلام کی حدیثوں میں صدق حدیث اور ادائے امانت یعنی سچائی اور امانتداری کا ذکر ساتھ ہی ساتھ ملتا ہے۔ اور عام طور سے گفتگو میں بھی صداقت و امانت ساتھ ہی استعمال ہوتا ہے

سچّائی کی اہمیت اور منزلت

جیساکہ اشارہ کیا گیا کہ سچّائی اور امانت داری انسان کی شرافت عظمتِ فکر اور اس کی پاکیزگی روح کی دو روشن نشانیاں ہیں۔

سچے لوگ عموماً شجاع، صاف گو، مخلص اور آسودہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے تعصّب اور افراط و تفریط سے مبرّا ہوتے ہیں اور سچائی بغیر ان صفات کے پائی بھی نہیں

جا سکتی ۔ اس کے برعکس جھوٹے لوگ عام طور سے بزدل، ریاکار، حریص، متعصب، بے حیا
اور اعتدال سے خالی ہوا کرتے ہیں۔

سچے لوگوں کی زندگی با اصول اور منظم ہوتی ہے یہ لوگ وقت کے دھارے سے
متاثر نہیں ہوتے اور فریب کاری، چاپلوسی اور منافقت سے بری ہوتے ہیں کیونکہ
یہ چیزیں سچائی کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔

اور جیسا کہ جھوٹ کے مضر اثرات کی وضاحت کے سلسلے میں ذکر کیا
جائے گا کہ یہ صفت انھیں مذکورہ رذائل کی دین ہے جن کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا، اسی
بنا پر سچائی کو انسان کے باطن کی کنجی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اہلبیت علیہم السّلام
کی حدیثوں میں سچائی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے، انسان کی معرفت کا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:—

"لا تنظروا الی طول رکوع الرجل و سجوده
فان ذلك شئ قد اعتاده ولو ترکه استوحش
لذلك ولكن انظروا الی صدق حدیثه و
اداء امانته" ۵۱

"کسی کے لمبے لمبے سجدوں اور رکوع پر مت جاؤ کیونکہ ممکن ہے کہ
عادت کی بنا پر ایسا کرتا ہو (اور ترک عادت موجب مرض ہے) اور اسے
چھوڑنے سے اسے وحشت ہوتی ہو، بلکہ اس کی صداقت اور امانداری
کی طرف دیکھو۔"

قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے:— ولتعرفنهم فی لحن القول ۵۲

۵۱ سفینۃ البحار، نقل از کتاب کافی ۵۲ سورہ محمد ۲۹

"منافقوں کو ان کی طرز گفتار سے پہچانو"

سچائی کے اعجاز نما آثار

اجتماعی اور سماجی نقطۂ نظر سے سب سے عظیم اور اہم خدمت جو سچائی اور امانت
داری کی دین ہے وہ حصول اطمینان و اعتماد ہے اور یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ تمام علمی،
صنعتی اور اقتصادی ترقیاں اجتماعی زندگی کی دین ہیں لیکن آپسی تعاون و ہم فکری جو اجتماعی
زندگی کی روح ہے اسی وقت حاصل ہوگی جب لوگ آپس میں ایک دوسرے پر پورا پورا
اعتماد و اطمینان رکھتے ہوں، اس کے بغیر اجتماعی زندگی بے شمار مشکلات اور افراتفری
کا شکار ہو کے رہ جائے گی اور بجائے مفید ہونے کے ایک درد سر بن جائے گی۔

اور یہ بات واضح ہے کہ اعتماد و اطمینان حاصل کرنے کا اہم ترین ذریعہ سچائی
اور امانت داری ہے اور خطرناک دشمن جھوٹ ہے۔ اگر کارخانے اور فیکٹری والے اپنے
کسی مال کی غلط اور جھوٹی تعریف کرنا شروع کر دیں تو ان کے بہترین مال کے بارے میں
بھی لوگ اطمینان نہیں کر سکتے۔

اگر سربراہان مملکت جھوٹے ہوں تو لوگوں کی نظر میں ان کے وعدوں اور دھمکیوں
کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی جس کے نتیجہ میں وہ اپنی ملت کی بے پناہ طاقت اور پشت پناہی
سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر علمی تحقیقات اور درس و تدریس میں جھوٹ
رائج ہو جائے تو کوئی طالب علم کسی معلم اور مفکر کی بات پر اعتماد نہیں کر سکتا جس کے نتیجہ
میں تمام تحقیقات اور علمی کتابیں مہمل اور بے فائدہ ثابت ہوں گی اور کسی چیز کی
تحقیق کے لئے تنہا ہر شخص کو بے انتہا زحمتیں برداشت کرنی پڑیں گی، اور لوگوں کی
ہزاروں سال کی زحمت کے بعد حاصل شدہ علمی اور فکری سرمائے اس کے لیے بے فائدہ
قرار پائیں گے اور یہ جھوٹ کی سب سے بدترین قسم ہے۔

جھوٹ گناہوں کی کنجی

سعد د روایات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ سچائی و امانت داری عمل کی پاکیزگی کا سبب اور جھوٹ گناہوں کی کنجی ہے۔

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے لئے اس حقیقت کا سمجھنا مشکل ہو کہ سچائی اور جھوٹ کس قدر انسان کے اعمال پر اثرانداز ہوتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اس نکتے کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ اور سب سے پہلے ان روایات سے بحث کی جائے۔ جو اہلبیت علیہم السلام سے وارد ہوئی ہیں:۔

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

الصّدق یھدی الی البر والبر یدعوا الی الجنۃ [1]

" سچائی لوگوں کو نیکی کی طرف دعوت دیتی ہے اور نیکی بہشت میں لے جانے والی ہے۔"

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

اذا صدق العبد قال اللہ صدق و برّ و اذا کذب قال اللہ کذب و فجر [2]

" جب کوئی سچ بولتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ اس نے سچ کہا اور اچھے کام انجام دیئے اور جس وقت جھوٹ بولتا ہے خدا فرماتا ہے کہ جھوٹ بولا اور اس نے بُرے کام انجام دیئے۔"

۳۔ امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

جعلت الخبائث کلھا فی بیت وجعل

[1] مشکوٰۃ الانوار طبرسی ص۱۵۷ [2] مشکوٰۃ الانوار ص۱۵۷

مفتاحھا الکذب [1]

" تمام بُرائیوں کو ایک کمرے کے اندر قرار دیا گیا ہے جس کی کنجی جھوٹ ہے۔"

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہے کہ جھوٹ تمام برائیوں اور گناہوں کی کنجی ہے۔
اب آیئے انسان کی عملی زندگی میں جھوٹ اور سچ کے آثار کو تلاش کریں:۔

۱۔ جھوٹ سرچشمۂ منافقت

سچائی زبان اور دل کے اتحاد و اتفاق اور جھوٹ ان دونوں کے اختلاف اور تضاد کا نام ہے اور یہیں سے انسان کے ظاہر و باطن میں فرق شروع ہو جاتا ہے اور جھوٹا انسان آہستہ آہستہ مکمل نفاق کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔

فاعقبھم نفاقاً فی قلوبھم الی یوم یلقونہ بما اخلفوا اللہ ما وعدوہ وبما کانوا یکذبون [2]

۲۔ جھوٹ بہت سی بُرائیوں کا مرکز

بہت سے گناہوں کا دارومدار جھوٹ ہی پر ہے جیسے بے ایمانی، دھوکے بازی، چوری، خیانت، کم فروشی، احتکار ۔۔۔۔ جھوٹے وعدے اور وعدہ خلافی ان سب گناہوں کا سرچشمہ جھوٹ ہے اور ایسے لوگوں کا کاروبار بغیر جھوٹ کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

۳۔ حاسد لوگ اپنے حسد کی آگ بجھانے کے لئے، مغرور اپنی بے جا بڑائی اور بزرگی ثابت کرنے کے لئے، چاپلوس لوگ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے۔ لالچی اور دُنیا پرست

[1] جامع السعادات ج ۲ ص ۳۲۳
[2] سورہ توبہ آیۃ ۷۸

اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے عام طور سے جھوٹ ہی پر تکیہ کرتے ہیں اور اسی کے ذریعہ محسود کو لوگوں کی نظر میں ذلیل و حقیر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی کے ذریعہ اپنے کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی کے ذریعہ طرح طرح کی چاپلوسیاں اور خوشامد کر کے اپنی حریص روح کو قانع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۴۔ جو شخص سچائی کے راستہ پر گامزن ہے وہ خود بخود اپنی اس صفت کی بنا پر بہت سے گناہوں سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ اسے یہ فکر ہوتی ہے کہ اگر کسی نے مجھ سے اس گناہ کے بارے میں سوال کر لیا تو اس کا سچا جواب اس کے لئے رسوائی کا سبب بنے گا، لہٰذا اس ذلّت اور رسوائی سے بچنے کے لئے ہمیشہ ایسے افعال سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور اس کی سچّائی اسے بہت سے گناہوں سے روکتی ہے۔

۵۔ ایک جھوٹ بسا اوقات بہت سے گناہوں کا سبب بنتا ہے کیونکہ ــــــــ

زیادہ تر جھوٹ بولنے والے ایک جھوٹ کی توجیہ کرنے کے لئے درجنوں جھوٹ بول ڈالتے ہیں، یا اس جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسرے بہت سے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔!

اس توضیح کے بعد یہ بات روشن ہوگئی کہ اگر انسان واقعاً سچّائی کو اپنا لے، تو خود بخود بہت سے گناہوں سے بچ سکتا ہے کیونکہ اکثر گناہوں کا سرچشمہ کسی نہ کسی طرح جھوٹ ہی قرار پاتا ہے۔ بغیر جھوٹ کے گناہوں کا بازار گرم نہیں ہو سکتا۔ جھوٹ تمام گناہوں کی کنجی ہے اور سچّا انسان بہرحال گناہوں سے بچنے پر مجبور ہے۔

جھوٹ اور ایمان میں تضاد

بہت سی روایات اس مطلب پر شاہد ہیں کہ جھوٹ اور ایمان دو متضاد

چیزیں ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے بلکہ جھوٹ کو علامت قرار دیا گیا ہے، عدم ایمان کی اور ان روایات کا منبع بھی قرآن کریم ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ــــــــ

انما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون بآیات اللہ واولٰئک ھم الکٰذبون [۱]

"وہی لوگ جھوٹ بولتے ہیں جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔"

ممکن ہے یہاں یفتری الکذب سے مراد تعمد الکذب ہو۔ اب یہاں پر ان بعض روایتوں کو ملاحظہ فرمائیں: ــــــــ

(۱) سئل رسول اللہ ص یکون المؤمن جباناً؟ قال نعم، قیل ویکون بخیلاً؟ قال نعم، قیل ویکون کذاباً؟ قال لا۔ [۲]

"رسول خدا ص سے سوال کیا گیا کہ کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ ص نے فرمایا کہ ہاں، پوچھا گیا کہ بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ ص نے جواب دیا کہ ہو سکتا ہے، پھر سوال کیا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے؟ آپ ص نے فرمایا کہ نہیں۔!"

(۲) قال امیر المؤمنین ع لا یجد العبد طعم الایمان حتی یترک الکذب ھزلہ وجدہ۔ [۳]

"امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انسان ایمان کے ذائقے کو نہیں

---

[۱] سورہ نحل آیۃ ۱۰۵

[۲] جامع السعادات جلد ۲ ص ۳۲۲

[۳] جامع السعادات جلد ۲ ص ۳۲۲

چکھ سکتا جب تک کہ جھوٹ کو مزاحاً بھی ترک نہ کرے۔"

(۳) وعنہ علیہ السلام: جانبوا الکذب فانہ مجانب للایمان [1]

"جھوٹ سے دُوری اختیار کرو کیونکہ جھوٹ ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔"

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان والے جھوٹ سے دُور رہتے ہیں۔

شاید اس کا سبب قلبی تاریکی کے علاوہ یہ بھی ہو کہ جھوٹے لوگ انبیاء علیہم السّلام کی دعوت پر بھی بہت کم ایمان لاتے ہیں کیونکہ جھوٹ ان کے وجود میں اس قدر سرایت کر جاتا ہے کہ وہ معمولی سے معمولی باتوں میں بھی جھوٹ کے علاوہ سچ نہیں بولتے، اس وجہ سے ان کے لئے یہ بات قابل تصور ہی نہیں ہوتی کہ وہ یقین کر لیں کہ انبیاء علیہم السلام اتنی اہم باتوں میں سچائی سے کام لیں گے۔

لہذا یہ تو ممکن ہے کہ ایسے لوگ مومنین کی صفوں میں اگر شامل ہو جائیں لیکن جب ان کے دلوں کا جائزہ لیں گے تو ان کے یہاں ایمان کا نام و نشان بھی نہ پائیں گے بلکہ اکثر شک و تردید میں مبتلا پائیں گے۔

البتہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو جھوٹ ہی کو اپنا مشغلہ بنا لیتے ہیں جنھیں روایات میں کذّاب کہا گیا ہے۔

سچے لوگ اس کے برعکس ہر بات کو آسانی سے مان لیتے ہیں چونکہ خود ہمیشہ سچ بولتے ہیں لہذا جو بات بھی سنتے ہیں اسے سچائی ہی پر محمول کرتے ہیں اور قرآن مجید کی اصطلاح میں "اُذن" یعنی بہت جلد کسی بات کو مان لینے والے ہیں سوائے ان باتوں

---

[1] مشکوٰۃ الانوار ص ۱۵۴

کے جس کی طرف انھیں توجہ دلائی جائے۔

جھوٹے افراد عام طور سے تمام لوگوں کو بدگمانی اور بُرائی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر چیز کو غلط اور خلافِ حقیقت تصور کرتے ہیں، یا کم از کم مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں ایسے لوگ ممکن نہیں ہے کہ شک و تردید کو چھوڑ کر مستحکم ایمان و یقین کے درجے پر فائز ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں جھوٹے گمراہ اور منافق لوگ اکثر ان کی طرف جھوٹ کی نسبت دیتے رہے ہیں۔

اور قیاس نفس کا تعلق انسان کے قلبی حالات سے ہے جس کے ذریعے سے بہت سی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔

جھُوٹ انسان کو لاابالی بنا دیتا ہے

جھوٹا انسان یہ تصور کرتے ہوئے بہت سے وظائف کو ترک کر دیتا ہے کہ وہ اس کی جھوٹی توجیہ کر کے مواخذہ سے بچ سکتا ہے، ایسے انسان کے لئے عہد و پیمان کا پابند نہ رہنا وقت کی پابندی نہ کرنا، یا وظائف کو انجام نہ دینا آسان ہے کیونکہ ان امور کے ارتکاب کے بعد جھوٹے اور بناوٹی عذر پیش کر کے اپنے کو مواخذہ اور سرزنش سے بچا سکتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس جو لوگ سچائی اور ایمان داری کے پیرو ہیں وہ مجبور ہیں کہ ان تمام امور کے پابند ہوں، لہذا کبھی لاابالی نہیں ہو سکتے۔

جھُوٹا انسان اپنے اوپر بھی اعتماد نہیں رکھتا

جھوٹ بولنے والے نہ صرف یہ کہ دوسروں پر بھروسہ نہیں کرتے کیونکہ وہ لوگ سب کو اپنے نفس پر قیاس کرتے ہوئے جھوٹا سمجھتے ہیں، بلکہ یہ لوگ اپنے اوپر بھی اعتماد نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہر چیز کی واقفیت اور حقیقت کے بارے میں بدگمانی سے کام لیتے ہیں اسلئے

یہ لوگ اپنی قدرت وصلاحیت کا بھی صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں کہ وہ حوادث کے مقابلے میں کتنی استقامت دکھا سکتے ہیں اور کتنا حوصلہ رکھتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ: ـــــــ

ایاك ومصادقة الکذاب فانه کالسراب یقرب علیك البعید ویبعد علیك القریب۔[1]

" جھوٹوں کی دوستی سے بچو، اس کی مثال سراب (ریت) جیسی ہے کہ دُوری کو تمھارے لئے نزدیک بنا کے پیش کردے گا اور نزدیکی کو دوری ثابت کردے گا۔"

اگرچہ یہ صفت یعنی حقائق کو منحرف کر کے پیش کرنا، جھوٹے مصاحبین کے بارے میں بیان کی گئی ہے لیکن جھوٹ کا عادی ہو جانے کے بعد ہر جھوٹ بولنے والے میں یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ لوگ حقائق کے بارے میں ہمیشہ بدگمانی سے کام لیتے ہیں چاہے اپنی ہی ذات سے متعلق کیوں نہ ہو اور یہ انسانی زندگی کے لیے خطرناک مرض ہے۔

جھوٹ کا سرچشمہ

جھوٹ کا سبب عام طور سے مندرجہ ذیل روحانی کمزوریاں ہوتی ہیں جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارہ کیا گیا، ڈر و خوف، فقر و فاقہ، طرفداروں کی قلت، عہدے اور ریاست کی فکر، مال و منصب سے شدید لگاؤ جیسی کمزوریاں انسان کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتی ہیں اور انسان ان کمیوں کو پورا کرنے کے لئے اس ناجائز وسیلہ یعنی جھوٹ کا سہارا لیتا ہے اور کبھی کبھی تعصب یا محبت و عداوت کی زیادتی و افراط انسان کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرتی ہے۔

اور ان سب سے خطرناک وہ جھوٹ ہے جو انسان علمی اور تحقیقی مسائل میں اپنے کو

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۳۸

علامۂ دہر ثابت کرنے کے لئے بولتا ہے۔

لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ تمام رُوحانی کمزوریاں انسان کو بدترین صفت یعنی جھوٹ کی طرف دعوت دینے والی ہیں، ان کا اصل سبب انسان کی ایمانی کمزوری ہے۔

جو لوگ اپنے اوپر اعتماد نہیں رکھتے ہیں اور ضعیف رُوح کے مالک ہیں، وہ حصول مقاصد اور نقصانات سے بچنے کے لئے جھوٹ، فریب اور خیانت وغیرہ کو وسیلہ قرار دیتے ہیں، برخلاف ان لوگوں کے جنھیں اپنی شخصیت پر پورا پورا اعتماد ہے اور قوی ہیں، یہ ہمیشہ اپنی کامیابیاں اپنی شخصیت میں تلاش کرتے ہیں۔

اسی طرح وہ صاحبان ایمان جو خداوند متعال کی بے انتہا قدرت کے معتقد ہیں، اور تمام نعمتوں اور سعادتوں کا سرچشمہ ارادۂ خداوندی کو جانتے ہیں اور اس کی قدرت و حمایت کو ہر قدرت و حمایت سے بالاتر سمجھتے ہیں، یہ لوگ کبھی کسی مقصد کے حصول یا دفع ضرر کے لئے غلط اور ناجائز ذرائع کا سہارا نہیں لیتے بلکہ ہمیشہ جھوٹ اور جھوٹے طریقوں سے بچتے ہیں۔

البتہ کبھی کبھی جھوٹ کے نقصانات سے غفلت اور سچائی کی اہمیت سے بے خبری یا گھر سماج اور دوستوں کا غلط ماحول انسان کو اس خطرناک صفت کا عادی بنا دیتا ہے۔

انسان میں احساس کمتری اور حقارت کا وجود بھی کبھی اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے تاکہ وہ جھوٹ کے ذریعہ اپنی اس کمی اور ذلت کا جبران کر سکے۔

جھوٹ سے بچنے کے ذرائع

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ جھوٹ کے اسباب کیا ہیں اور کون کون سے صفات ہیں جو اس خطرناک صفت کو قوی اور پائیدار بنانے میں موثر ہیں، اس کا علاج بھی کافی آسان ہو جاتا ہے

اس روحانی بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لئے حسب ذیل طریقوں کو اپنانا چاہیے۔

۱۔ سب سے پہلے ایسے لوگوں کو جھوٹ کے دردناک نتائج اور بدترین اثرات مادی ومعنوی شخصی وسماجی کی طرف متوجہ کرنا، اور آیاتِ قرآن کریم اور اقوال ائمہ معصومین علیہم السلام کی روشنی میں جھوٹ کے فرضی فوائد اور اس کے مفاسد کا موازنہ کرتے ہوئے انھیں اس حقیقت کا یقین دلایا جائے کہ جھوٹ کے وقتی اور فرضی فوائد اور اس کے بے شمار مفاسد کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں اور یہ بھی بتایا جائے کہ اگر کہیں کہیں جھوٹ کی وجہ سے شخصی منفعت بھی ہوتی ہے تو وہ فائدہ وقتی اور جلدی ختم ہو جانے والا ہے کیونکہ معاشرہ میں زندگی گزارنے والے انسان کے لئے (چاہے وہ کسی جگہ یا سوسائٹی کا رہنے والا ہو) لوگوں کے اعتماد و وثوق سے بڑھ کر کوئی سرمایہ نہیں ہے جس کا سب سے بڑا دشمن یہی جھوٹ ہے۔

یہاں اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ بعض لوگوں کا یہ تصور کہ ممکن ہے کہ انسان اس طرح جھوٹ بولے کہ وہ فاش نہ ہونے پائے اور اعتماد و وثوق بھی باقی رہے، یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ تجربہ اور مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

اکثر جھوٹ بولنے والوں کا جھوٹ فاش ہی ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو حادثہ بھی واقعاً رونما ہوتا ہے مکان زمانہ اشخاص اور دوسرے حادثات سے کسی نہ کسی طرح مرتبط ہوتا ہے لیکن فرضی اور جھوٹا حادثہ ان تمام حالات و روابط سے خالی ہوتا ہے اور جو شخص جھوٹے حادثے کا موجد ہے اسے ان امور کی طرف توجہ نہیں ہوتی اگر بہت ہوشیار بھی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ چند جھوٹ اور گڑھ لے گا تاکہ اس کی مدد سے جھوٹے حادثے کو واقعی ثابت کر سکے لیکن یہ بات اس کے امکان سے باہر ہے کہ وہ تمام مرتبط حالات و ربط کے بارے میں پہلے سے غور و فکر کر کے اقدام کرلے۔ لہٰذا ایسا انسان چند مختلف سوالوں اور جرح کے بعد خود ہی اس جھوٹے حادثے کی توجیہ سے عاجز ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر حضرت علی علیہ السلام کا وہ بہترین فیصلہ جو آپ نے ایک نوجوان کے بارے

میں فرمایا جس کا باپ کافی مال و اسباب کے ساتھ ایک مسافرت میں گیا تھا، واپسی میں اس کے ساتھیوں نے اسے قتل کر دیا اور دعویٰ کیا کہ وہ راستے میں انتقال کر گیا۔

یہ اتہام لگانے والے دراصل اس کے قاتل تھے، حضرت علی علیہ السلام نے ان سے مختلف سوالات کرنا شروع کر دیے، اس کی بیماری کے بارے میں، انتقال اور دفن و کفن اور ان کی جزئیات کے بارے میں، تو وہ لوگ فوراً ذلیل و رسوا ہو گئے کیونکہ ان لوگوں نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ سب اتفاقی طور پر کہہ دیں گے کہ بیمار ہو کر انتقال کر گیا، لیکن کب اور کتنے بجے، کس مقام پر اس نے انتقال کیا، کس نے اس کو غسل و کفن دیا، کس نے نماز جنازہ پڑھائی ——— ان جزئیات کے بارے میں ان لوگوں نے پہلے سے سوچا ہی نہیں تھا، اور نہ ان کے امکان میں تھا کہ ان سارے جزئیات کے بارے میں پہلے سے طے کرتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ بولنے والا کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو، ایک معمولی سی جرح اور تحقیق کے بعد اس کا جھوٹ فاش ہو جاتا ہے، اور جھوٹے لوگ فرضی واقعے کی توجیہ کے لئے جو بھی جھوٹ گڑھتے ہیں اس میں چونکہ واقعیت نہیں ہوتی لہٰذا جلد ہی ذہن سے نکل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کچھ ہی مدت کے بعد ان سے اس واقعے کے بارے میں سوالات کیے جائیں تو ان کے بیان میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بات برقرار نہیں رکھ سکتے اور یہی اختلاف اور تضاد ان کے جھوٹ کو ثابت کر دیتا ہے اور یہ مثل بھی کافی مشہور ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" (جھوٹا شخص حافظہ نہیں رکھتا) اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ کتنا ہی قوی حافظہ کا مالک کیوں نہ ہو چونکہ جھوٹ کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی لہٰذا وہ اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ حافظہ میں رہ سکے۔

۲۔ حسِ جاہ طلبی

جھوٹ سے بچنے کے لئے دوسرا موثر اقدام حس منصب طلبی کی صحیح تسکین ہے کیونکہ اس کی عدم تسکین انسان کو جھوٹ بول کر فرضی جاہ و منصب کے اظہار پر مجبور کرتی ہے۔

اور اس غلط راستے سے انسان اپنی اس کمی کو دُور کرنا چاہتا ہے۔ اگر انھیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ان کے وجود میں خود ایسی قوتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں کہ اگر انھیں رو بہ کار لایا جائے تو خود بخود معاشرہ میں بہترین عزّت و مقام حاصل ہو سکتا ہے اور اسے جھوٹ بول کر جھوٹے اور فرضی منصب و مقام کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں رہتی اور ان لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہیے کہ ایک سچّا انسان اپنی سچائی کی بنا پر پورے معاشرہ کی نظر میں محترم اور قابلِ اطمینان و اعتماد ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا منصب اور سرمایۂ معنوی ہے جس کے سامنے دُنیا کے تمام مادی سرمایے بے قیمت ہیں کیونکہ اطمینان و اعتماد کی اس منزل پر فائز ہونے والا انسان ہر طرح کے مادی وسائل بھی حاصل کر سکتا ہے اور لوگوں کی نظر میں محترم ہونے کے ساتھ ساتھ خداوند عالم کی بارگاہ میں بھی اس کا وہ درجہ و مقام ہے جو انبیاء و شہداء کا درجہ ہے کیونکہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں سچے لوگوں کا ذکر انبیاء علیہم السلام اور شہداء راہ خدا کے ساتھ کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ومن یطع اللہ والرّسول فاولٰئك مع الذین انعم اللہ علیھم من النّبیّین والصدّیقین والشّھداء والصّلحین وحسن اولٰئك رفیقاً [۱]

"جو لوگ خدا و رسُول کی اطاعت کرتے ہیں وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا کی نعمتیں نازل ہوئی ہیں اور یہی لوگ بہترین مصاحب ہیں۔"

فاضلِ معروف راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں صدّیق کے چند معنی ذکر کیے

---

[۱] سورہ نساء آیۃ ۶۹

ہیں اور وہ سبھی ہمارے دعوے کی تائید کرتے ہیں:۔

(۱) صدّیق: جو زیادہ سچا ہو (۲) جو کبھی جھوٹ نہ بولے (۳) جو عقیدہ و زبان دونوں کے اعتبار سے سچا ہو اور اس کا عمل اسکی صداقت کی تصدیق کرتا ہو۔

۳۔ جھُوٹ سے بچنے کی تیسری تدبیر

اس گناہ سے آلودہ افراد کے دلوں میں عقیدہ خدا کی تقویت کرنا اور انھیں توجہ دلانا کہ قدرت خدا کی تمام قدرتوں سے بلند و بالا ہے اور خداوند عالم ان تمام مشکلات کے حل کرنے پر قادر ہے جن کے لئے ضعیف الاعتقاد انسان جھوٹ کا سہارا لیتا ہے جبکہ سچا انسان ہر مشکل و مصیبت میں خدا ہی کا سہارا لیتا ہے اور اسے ہر حال میں اپنا پشت پناہ سمجھتا ہے، حالانکہ جھوٹا انسان ان موقعوں پر یکہ و تنہا ہوتا ہے۔

۴۔ ان تمام بُرائیوں کو اپنے سے دُور کرنا جو جھوٹ کی نشو و نما کا سبب قرار پاتی ہیں جیسے حرص، بزدلی، خود غرضی، حد سے زیادہ دوستی یا دشمنی وغیرہ ان بُرائیوں سے اپنے کو پاک کرے تاکہ یہ بدترین صفت انسان کے اندر پرورش نہ پا سکے۔

۵۔ اس گناہ میں ملوث لوگوں کے ماحول اور معاشرہ کو جھُوٹے افراد سے پاک کر کے انھیں سچائی کے ماحول میں رکھا جائے تاکہ سماج کے پاکیزہ ماحول کو دیکھ کر وہ بھی آہستہ آہستہ اپنے کو اس بُرائی سے پاک کر سکیں۔

اور معاشرہ کی اصلاح اسلامی احکام تربیت میں اتنی ہی زیادہ اہم ہے کہ مولائے متقیان حضرت علی علیہ السّلام ارشاد فرماتے ہیں:

لا یصلح الکذب جد ولا ھزل ولا ان یعد احدکم صبیہ ثم لا یفی لہ [۱]

یعنی مزاحاً بھی جھوٹ نہ بولے اور اپنے چھوٹے بچوں تک سے وعدہ خلافی سے

---

[۱] وسائل الشیعہ جلد۳ ص ۲۳۲

کام نہ لے۔" والدین اگر واقعی اس قدر محتاط ہوں کہ وہ چھوٹے چھوٹے وعدے جو بچوں سے کرتے ہیں اس میں بھی سچے ہوں تو اولاد کے جھوٹے ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

جھوٹ کے استثنائی موارد

بزرگ فقہاء اور علماء اخلاق نے اس موضوع کی احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے بعض مقامات پر جھوٹ کو جائز قرار دیا ہے ان میں سے بعض خلاصہ کرکے دو موارد ذکر کیے ہیں: ——————

۱۔ حالت اضطرار میں

۲۔ مومنین کے درمیان صلح و مصالحت کی غرض سے۔

پیغمبر اکرم ص سے منقول ہے: احلف باللہ کاذباً و نج اخاک من القتل[1] "جھوٹی قسم کھالو اور اپنے بے گناہ بھائی کو قتل سے نجات دو۔"

یہاں دو باتوں کی طرف توجہ رکھنا بہت ضروری ہے:۔

۱۔ اوّلاً یہ کہ ان تمام مستثنیٰ موارد کی بازگشت اصل میں صرف ایک موضوع کی طرف ہوتی ہے وہ یہ کہ جھوٹ کے مصالح و فوائد جن مقامات پر اس کے مفاسد پر غالب ہونگے وہاں جھوٹ بولنا جائز ہے، اور یہ بات صرف جھوٹ ہی سے مختص نہیں ہے بلکہ سبھی محرمات جیسے مُردار کھانا، یتیم کو ایذا پہونچانا وغیرہ بھی حفاظتِ نفس یا تادیب وغیرہ کی غرض سے جائز ہے۔

اور جو موارد احادیث میں ذکر کیے گئے ہیں وہ بطور مثال ہیں:۔

مومنین کے درمیان مصالحت کرانا اور ان کے دلوں سے کینہ و عداوت کو دُور کرنا اس جھوٹ سے کہیں زیادہ اہم ہے جس سے کسی کو ضرر نہ پہونچے اس لیے ایسی جگہ

[1] مناجر شیخ انصاری "بحث کذب"

پر جھوٹ کو جائز قرار دیا گیا ہے، اسی طرح حفاظت نفسِ مومن یا عزّت وغیرہ کے تحفظ یا جنگ کے موقع پر جہاں ایک جھوٹ کبھی کبھی جنگ کے خاتمے یا بہت سے مومنین کو قتل و غارت سے بچانے کا سبب قرار پاتا ہے، یا ظالم و جابر کی شکست و ذلّت کا سبب بنتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی میاں بیوی کے درمیان ایسی گفتگو چھڑ جاتی ہے کہ اگر وہاں جھوٹ کا سہارا نہ لیا جائے تو جدائی یا بدترین صورتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مقامات پر چونکہ جھوٹ کے مصالح و فوائد اس کے فساد سے زیادہ اہم ہیں اس لیے جھوٹ کو جائز قرار دیا گیا ہے اور اگر ہم بغور ان موارد کا مطالعہ کریں تو ہم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان موارد میں جھوٹ کا مفسدہ اور ضرر بہت کم اور نہ ہونے کے برابر ہے۔

ب۔ دوسری بات یہاں یہ قابل توجہ ہے کہ ان موارد میں جھوٹ کا جواز بالکل اسی طرح ہے جس طرح حالتِ اضطرار میں مُردار چیز کا کھانا (اکل میتہ) کہ صرف ضرورت تک اکتفا کی جائے گی ضرورت برطرف ہوتے ہی اسی طرح حرام اور ناجائز ہوگا۔ نہ یہ کہ مستثنیٰ موارد انسان کو اس گناہ کبیرہ کی طرف سے جری بنا دیں اور یہ بہانہ لے کر ہر معمولی سے فائدہ کے لیے جھوٹ کو جائز سمجھنے لگے۔ کیونکہ زیادہ تر اخلاقی برائیاں انھیں استثنار سے غلط فائدہ اٹھانے کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت ان مشتبہات جیسی ہے جو خطرے اور ممنوع منطقوں سے متصل ہوتے ہیں اور روایات میں حمی اللہ اور حول الحمی سے تعبیر کیا گیا ہے: ——————

محارم اللہ حمی اللہ فمن یرتع حول الحمی یوشک ان یقع فیھا۔ "محرمات خدا کے ممنوعہ منطقے ہیں اور جو شخص اپنے جانوروں کو ممنوعہ علاقہ کے قریب چرائے گا اس بات کا خطرہ ہے کہ جانور اس ممنوعہ منطقے میں داخل ہو جائیں۔"

غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم کی جس فصل میں جھوٹ کے مستثنیٰ موارد کے بارے

میں بحث کی ہے، اس کے آخر میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اعمال کی فضیلت یا گناہوں سے ڈرانے کے سلسلے میں جھوٹی احادیث بنا کر پیش کرنا جائز ہے پھر لکھتے ہیں کہ یہ ایک ہوس اور باطل خیال ہے کیونکہ اس جھوٹ کے مصالح اس کے مفاسد کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ بے شمار آیات اور صحیح روایتوں کے ہوتے ہوئے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے تمام احکام شریعت غیر معتبر اور مشکوک ہو جائیں گے۔[1]

اور میری نظر میں یہ کام بالکل غیر معقول اور احمقانہ ہے اور اس کا سبب ان لوگوں کی جہالت اور بے خبری ہے کہ یہ لوگ اپنے کو خدا و رسولؐ سے بھی زیادہ اسلام کا خیر خواہ سمجھتے ہیں ان لوگوں کا یہ فعل شر محض ہے اور اس میں سوائے نقصان و فساد کے کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس طرح کے جاہل دوستوں کا خطرہ اسلام کے لئے اس کے دشمنوں سے کم نہیں ہے۔

توریہ کیا ہے؟

"توریہ" "توصیہ" کے وزن پر ہے۔ اس کلام کو کہتے ہیں جس کے ظاہر سے کچھ سمجھ میں آئے اور کہنے والے کی مراد کچھ اور ہو۔ فقہاء امامیہ کے نزدیک یہ بات مشہور ہے کہ جن مقامات پر جھوٹ بولنا جائز ہے وہاں توریہ کرنا ضروری ہے، اور جہاں تک ممکن ہو توریہ صراحۃً جھوٹ کا مرتکب نہ ہو۔ علمائے اہل سنّت کی بعض عبارتوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ موضوع ان کے نزدیک بھی شہرت کا حامل ہے۔ توریہ کے معنی یوں کیے گئے ہیں:۔

توریہ: یعنی انسان کوئی کلام کرے اور اس کے واقعی معنی کا ارادہ بھی رکھتا

---

[1] احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۳۹

لیکن وہ کلام اس طرح کا ہو کہ سننے والا اس سے کوئی دوسرا معنی سمجھے۔ جیسے کسی سے سوال کیا گیا کہ پیغمبرؐ کا جانشین کون تھا، اس نے جواب دیا کہ وہ شخص کہ اس کی لڑکی اس کے گھر میں تھی (یعنی زوجہ تھی) سننے والے نے یہ سمجھا کہ وہ شخص جس کی لڑکی پیغمبرؐ کے گھر میں تھی، حالانکہ کہنے والے کی مراد یہ تھی کہ وہ شخص کہ پیغمبرؐ کی لڑکی جس کے گھر میں تھی (من بنتہ فی بیتہ)

اب اس مقام پر سب سے اہم بحث یہ ہے کہ جھوٹ کی دلیلیں توریہ کو شامل ہیں یا نہیں یعنی توریہ بھی جھوٹ ہی کی ایک قسم ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں تین قول ہیں:

۱۔ بعض کا نظریہ ہے کہ توریہ جھوٹ نہیں ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ضرورت کے وقت اس طرح کلام کرے کہ جھوٹ کے دائرہ سے خارج ہو اور یہ لوگ یوں استدلال کرتے ہیں کہ کلام کے سچ یا جھوٹ کا تعلق کلام کرنے والے کے قصد اور ارادے سے ہے اگر متکلم کی مراد صحیح اور واقعی ہوگی تو وہ کلام سچ ہوگا، اگرچہ سننے والا کچھ اور ہی کیوں نہ سمجھے، اسلئے کہ سننے والے کا اشتباہ متکلم کے کلام پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے قول کی توجیہ کے لئے جو آپ نے بُت پرستوں کے جواب میں فرمایا تھا "بل فعلہ کبیرھم ھذا فاسئلوا ھم ان کانوا ینطقون" (بلکہ ان کے بڑے نے یہ کیا ہے اگر یہ بولیں تو ان سے پوچھ لو) متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے دربار میں جوان کے بھائیوں کو کہا گیا تھا کہ: "انکم لسارقون" (بے شک تم لوگ چور ہو) یہ تمام روایات اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ توریہ جھوٹ نہیں ہے۔

۲. دوسرا قول بعض علماء کا ہے جیسے مرحوم محقق قمی رح کہ توریہ جھوٹ ہی کا جزء ہے کیونکہ سچ اور جھوٹ کا معیار ظاہر ہے کہ کس معنی میں ظہور رکھتا ہے نہ کہ مرادِ متکلم۔

۳. دوسرے بعض علماء جیسے غزالی وغیرہ کی بعض عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ توریہ جھوٹ کا مصداق تو ہے لیکن اس کا مفسدہ صریحی جھوٹ سے کمتر ہے۔

شاید اس نظریہ کی وجہ یہ ہو کہ چونکہ صریحی جھوٹ میں کلام ظاہر اور مراد دونوں ہی خلاف واقع ہوتی ہیں اور توریہ میں جھوٹ کا قصد نہیں ہوتا اس لئے اس کا مفسدہ بھی جھوٹ سے کم ہے۔

توریہ کی تازہ ترین تفسیر

یہاں ایک خاص نکتہ کی طرف توجہ شاید اس موضوع کی مشکلات کے حل کے لئے کلیدی حیثیت رکھتی ہو، وہ یہ کہ توریہ ہر خلاف ظاہر کے ارادہ کا نام نہیں ہے بلکہ صرف ان موارد کے لئے ہے جہاں کلام ذاتی طور پر ذو معنی کی صلاحیت رکھتا ہو اور ہر دو معنی مراد لیے جا سکتے ہوں لیکن ذہن ان میں سے کسی ایک ہی کی طرف متوجہ ہو جیسے جملہ اِنَّکُمْ لَسَارِقُوْن حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے کہا گیا کہ "بیشک تم لوگ چور ہو"!

اس جملہ کا معنی اوّل تو وہی اس وقت کی دربار کی چوری ہے لیکن اس لفظ سے سرقتِ قبلی بھی مراد لی جا سکتی ہے جو معنی اوّل کے خلاف ہے کہ تم لوگوں نے یوسفؑ کو ان کے پدر بزرگوار سے چرایا ہے۔

• یا جیسے کسی سے پوچھا جائے کہ یہ لباس تم کو فلاں نے ہدیہ کیا ہے اور وہ جواب دے کر خدا اسے عمر دے۔ سننے والا اس سے یہ تصور کرتا ہے کہ اس کی مراد یہ ہے کہ ہاں خدا اسے عمر عطا کرے حالانکہ اس کا ارادہ نہیں تھا۔

—— * ——

۵

غیبت

- ایک خطرناک حربۂ عاجزانہ
- محرکاتِ غیبت
- غیبت کے خطرات
- غیبت کے انفرادی و اجتماعی مفاسد
- دائرۂ غیبت اور اس کے حدود
- غیبت کے مستثنیٰ موارد
- کھلا ہوا فاسق کون ہے اور اس کی غیبت کیوں جائز ہے؟

غیبت

ایک خطرناک حربہ عاجزاء

زبان کے گناہوں میں سے ایک بہت بڑا اور خطرناک گناہ جو معاشرہ میں بہت زیادہ رائج ہے وہ غیبت ہے۔

غیبت یعنی کسی کی مخفی کمزوریوں اور عیوب کو بیان کرنا کہ اگر وہ سُنے تو اسے تکلیف پہونچے۔ چاہے یہ عیوب اور کمزوریاں دینی ہوں یا اخلاقی وسماجی، اس کے جسم و قیافہ سے متعلق ہوں یا اس کی رفتار و گفتار سے، اس کی ذات سے متعلق ہوں یا اس کے متعلقین، بیوی بچے، لباس و مکان وغیرہ سے۔

غیبت کے اہم ترین محرکات: چند چیزیں

۱۔ کینہ و انتقام

کینہ و انتقام کے وہ شعلے جو کسی کی طرف سے انسان کے سینوں میں بھڑکتے رہتے ہیں، اسے کم کرنے کا سب سے آسان طریقہ غیبت ہے کہ اس کے ذریعہ سے اسے ذلیل و رسوا کیا جائے۔

۲۔ حسد ۔ حسد کرنے والا ہمیشہ محسود کی نعمتوں کا زوال چاہتا ہے

جب اس کا یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو غیبت کے ذریعے کوشش کرتا ہے کہ اسے ذلیل و پست کرے اور اس طرح اپنے حسد کی گرمی کو کم کرے۔

۳۔ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کے لئے

دوسروں کے عیوب کو ذکر کر کے اپنے عیب کو معمولی ظاہر کرتا ہے

۴۔ مذاق اڑانے کے لئے

اگرچہ دوسروں کا استہزاء اور مذاق اڑانے کے بہت سے محرک ہوتے ہیں اور یہ محرکات جب انسان کے اندر اپنی بنیادیں مستحکم بنا لیتے ہیں تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے غیبت کو بھی وسیلہ قرار دیتے ہیں۔

۵۔ تفریح

اکثر لوگ بغیر ان محرکات کے جن کا ذکر کیا گیا، صرف محفل کو گرم کرنے کے لئے اور تفریح کی غرض سے دوسروں کے عیوب اور کمزوریوں کو بیان کرتے ہیں، کیونکہ لوگوں کی نظر میں غیبت سے زیادہ شیریں کوئی گناہ نہیں ہے اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نہ صرف یہ لوگ چہل پہل اور تفریح سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو ہنسانے اور تفریح کے لئے وارد کرنے میں بھی انھیں کافی مزہ آتا ہے۔

۶۔ حس تحقیق و تجسس

یہ احساس انسان میں دوسرے احساسات سے محکم اور قوی تر پایا جاتا ہے جو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ لوگوں کو غیبت کے لئے آمادہ کیا جائے اور بعض لوگوں کو شاید اسی وجہ سے غیبت خوش ذائقہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ لوگ دوسروں کے عیوب و اسرار کے تجسس اور تحقیق میں لذت محسوس کرتے ہیں اس لئے لوگوں کو حرص و طمع دلا کر اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کی غیبت کریں۔ اگرچہ ان محرکات کی طرف توجہ اس کے علاج اور معرفت کے لئے کافی مفید اور معاون ہے اور یہ بات

بھی قابلِ توجہ ہے کہ بسا اوقات عوامل انسان میں بہت سادہ انداز میں رونما نہیں ہوتے کیونکہ انسان کا ضمیر خود اس کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے یہ اسباب اپنی اصل شکل و صورت بدل کر نہی عن المنکر، خیر خواہی اور درس عبرت دینے کے انداز میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس طرح دوسروں کی غیبت بھی کرتے ہیں اور بخیال خود ایک مقدس کام انجام دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کا محرک دراصل عوامل مذکورہ میں سے کوئی ایک ہوتا ہے۔ انسان اپنی روح و ضمیر کو دھوکہ دینے کے لئے اور عذاب و سرزنش سے فرار کرنے کے لئے اسے دوسرا جامہ پہنا دیتا ہے اور اس کے اصل چہرے پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ حالانکہ غیبت کی یہ قسم اس کی تمام قسموں سے زیادہ خطرناک ہے اور اس سے نجات حاصل کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔

خطراتِ غیبت

اب اس گناہ کے بارے میں قرآن کریم اور احادیث پیغمبر و ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے ارشادات، ان کا تجزیہ اور غیبت کے فردی و اجتماعی مفاسد کی طرف قارئین کو متوجہ کیا جاتا ہے باوجود اس کے کہ لوگ اس کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں اسلام نے اپنے بنیادی قوانین میں اس زندگی بخش اور روح پرور مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید اور روایات میں غیبت کے بارے میں بہت سخت تعبیریں ذکر کی گئی ہیں جن میں سے دس موارد کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اسلام کی نظر میں اس گناہ کی اہمیت واضح ہو جائے۔

۱۔ قرآن مجید صاف صاف غیبت سے روکتا ہے اور اسے ایک غیر انسانی فعل شمار کرتا ہے یعنی اپنے مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ آدم خوری وہ بھی اس نوعیت سے یعنی مردہ انسان کا گوشت کھانا شاید

ہو کسی انسان سے یہ فعل سرزد ہوا اور یہ تعبیر صرف غیبت ہی کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور اس تشبیہ کی علت بھی واضح ہے کیونکہ اسلامی نکتہ نظر سے ایک مسلمان کی عزت و آبرو اسی طرح محترم ہے جس طرح اس کا خون محترم ہے جیسا کہ حدیث نبوی میں ہے:

"کل المسلم علی المسلم حرام دمه وماله وعرضه"

"مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو"۔ ۱؎

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیبت مسلمان بھائی کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیتی ہے یہ نکتہ بھی یہاں قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید کی اس آیہ کریمہ میں پہلے بدگمانی سے روکا گیا ہے پھر تجسس سے اور اس کے بعد غیبت سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

یا ایها الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضاً ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیه میتا فکرهتموه واتقوا الله ان الله تواب الرحیم

(حجرات - ۱۲)

"اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے اجتناب کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں اور تجسس مت کرو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، یقیناً اس سے نفرت کرتے ہو اور خدا سے ڈرو، خداوند عالم

۱؎ کشف الریبہ، احیاء العلوم، محجۃ البیضاء

توبہ قبول کرنے والا ہے اور مہربان ہے"۔

اور شاید اس ترتیب کی وجہ یہ ہو کہ انسان سب سے پہلے بدگمانی میں مبتلا ہوتا ہے اور یہی بدگمانی اسے تجسس پر آمادہ کرتی ہے اور تجسس کے بعد جب لوگوں کے پوشیدہ عیوب سے باخبر ہو جاتا ہے تو انھیں بیان کر کے غیبت کا مرتکب ہوتا ہے۔ لہٰذا بدگمانی اور تجسس غیبت کا مقدمہ اور سرچشمہ ہیں۔

غیبت انسان کے ساتھ سازگار نہیں

جیسا کہ براء کی حدیث ہے:۔

خطبنا رسول الله حتی استمع العوائق فی بیوتها فقال: یا معشر من آمن بلسانه ولم یومن بقلبه لا تغتابوا المسلمین ولا تتبعوا عوراتهم فانه من تتبع عورة اخیه تتبع الله عورته ومن تتبع الله عورته یفضحه ولو فی جوف بیته ۱؎

"براء سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ نے ہمارے لئے اتنی بلند آواز میں خطبہ دیا کہ گھر کی لڑکیوں تک نے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ اے وہ لوگو! جو دل سے نہیں صرف زبان سے ایمان لائے ہو مسلمانوں کی غیبت مت کرو اور ان کے پوشیدہ عیوب کے بارے میں تجسس سے کام نہ لو کیونکہ جو شخص اپنے دینی بھائیوں کے پوشیدہ عیوب کے بارے میں تجسس کرتا ہے خدا اس کے پوشیدہ عیوب کو آشکار کر کے اسے گھر کے اندر ہی رسوا کر دیتا ہے"۔

۱؎ عورۃ: ہر وہ چیز جس کے تذکرہ سے شرم آئے۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے یہ حدیث اس قدر بلند آواز میں فرمائی کہ گھروں کے اندر پردہ دار لڑکیوں تک نے سُنا۔

غیبت اور ایمان کے درمیان تضاد کی وجہ شاید یہ ہو کہ ایمان کی اولین علامت مومن کے حق کی رعایت ہے اور غیبت اس کے منافی ہے۔

غیبت بُرائیوں کے آشکار کرنے کے مترادف ہے

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من قال فی مومن مارائته عیناه وسمعته اذناه فهو من الذین قال الله عزوجل ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین آمنوا لهم عذاب الیم۔

"جو شخص کسی مومن کے بارے میں جو اس نے دیکھا یا سنا ہو بیان کرے وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں خدا فرماتا ہے کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ مومنین کی برائیوں کو آشکار کریں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

اس نکتہ کا سبب بھی واضح ہے کیونکہ مومنین کے پوشیدہ عیوب کو آشکار کرنا جبکہ عموماً یہ عیوب دینی امور سے متعلق ہوتے ہیں جس سے سننے والوں میں گناہ کی جرات پیدا ہوتی ہے اور یہ خود برائیوں کے شائع ہونے کا سبب ہے۔

غیبت کا فساد زنا سے شدید تر ہے

جناب جابر اور ابو سعید خدری نے اس مشہور و معروف روایت کو پیغمبر اکرم ﷺ

سے نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

الغیبة اشد من الزنا۔ "غیبت زنا سے بدتر ہے۔"

اور بدتر ہونے کی وجہ بھی اسی روایت کے آخر میں مذکور ہے کہ زنا کرنے والا ممکن ہے کہ توبہ کر لے اور خدا اسے معاف کر دے کیونکہ زنا الٰہی حقوق میں سے ہے برخلاف غیبت کے جو (حقوق الناس) لوگوں کا حق ہے لہذا جب تک وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی گئی ہے اس وقت تک توبہ و استغفار بے فائدہ ہے۔

اور ممکن ہے کہ غیبت کے زنا سے شدید تر ہونے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہو غیبت کی وجہ سے باہمی اخلاق و محبت اور اتحاد و اخوت کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں اور اس سے معاشرہ کو عظیم نقصان پہونچتا ہے۔ (جس کی توضیح انشاءاللہ آگے آئے گی) حالانکہ زنا میں اور تمام مفاسد کے باوجود یہ تاثیر نہیں ہے۔

غیبت عبادات کی قبولیت میں مانع ہے

معاذ سے روایت ہے کہ کبھی کبھی بندوں کے نیک اعمال آفتاب کی شعاعوں کی طرح چمکتے ہوئے آسمان کی طرف بڑھتے ہیں لیکن انھیں پلٹا دیا جاتا ہے اور اس شخص کے منھ پر مار دیا جاتا ہے اور ایک فرشتہ اس وقت کہتا ہے:

امرنی ربی ان لا ادع عمل من یغتاب الناس یتجاوز الی ربی۔

"مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ کسی غیبت کرنے والے کے نیک عمل کو اپنے پروردگار تک نہ جانے دوں۔"

اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو جیسا کہ متعدد روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے اور ایک عام حکم ہے کہ ان لوگوں کے اعمال خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں جن کی گردن پر

دوسروں کے حقوق ہیں اور غیبت کے بارے میں ذکر کیا گیا کہ مومن کی حق تلفی اور اس کی ضرورت کا ضائع کرنا ہے۔

غیبت اسلامی اخوت کے خلاف ہے

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا یغتب بعضکم بعضاً وکونوا عباد اللہ اخوانا

"آپس میں بغض و حسد سے کام نہ لو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، اور اے خدا کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔"

روایت کے آخری جملے سے پتہ چلتا ہے کہ حسد، عداوت اور غیبت کے مقابلہ میں خدا کی بندگی اور اسلامی اخوت ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ اخوت کی سب سے پہلی علامت اخلاص و محبت ہے جو غیبت کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتی۔ روایت میں اور دو عیوب کا ذکر شاید اس وجہ سے ہو کہ یہ دونوں غیبت کے اسباب میں سے ہیں کیونکہ حسد عموماً عداوت کا سبب بنتا ہے اور عداوت انسان کو غیبت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

غیبت نیکیوں کو کھا جاتی ہے

بہت سی روایتیں اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں منجملہ امام جعفر صادق ع سے روایت ہے:۔

الغیبة حرام علی کل مسلم وانها لتاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔

"غیبت ہر مسلمان پر حرام ہے اور غیبت نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔"

دوسری روایت میں پیغمبرؐ اکرم ارشاد فرماتے ہیں:۔

من کانت لاخیه عنده مظلمة فی عرض او مال فلیستحلها منه من قبل ان یاتی یوم لیس هناك دینار ولا درهم یوخذ من حسناته فان لم یکن له حسنات اخذ من سیئات صاحبه فیزید علی سیئاته۔

"جس کی گردن پر کسی دینی بھائی کا حق ہو چاہے مال کی صورت میں ہو یا عزت سے متعلق اسے چاہیئے کہ وہ اس کو راضی کرے قبل اس کے کہ وہ آجائے (روز محشر) کہ جس دن نہ دینار ہوگا نہ درہم۔ اس دن اس شخص کی نیکیوں کو اس حق کے عوض میں صاحب حق کی طرف منتقل کر دیا جائیگا اور اگر اچھائیاں اس کے نامہ اعمال میں ہیں ہی نہیں تو صاحب حق کے گناہ کم کر کے اس شخص کی طرف منتقل کر دیئے جائیں گے۔"

ممکن ہے اس حدیث کا مفہوم "غیبت نیکیوں کو کھا جاتی ہے" یہی ہو کیونکہ غیبت انسان کے عظیم ترین سرمایہ معنوی یعنی اس کی عزت اور سماجی وقار کو خاک میں ملا دیتی ہے اور اس حق کا جبران چونکہ مادی اعتبار سے ناممکن ہے اس لئے کہ خداوند روز محشر اسے ایک معنوی سرمایہ دے کر یعنی اس کی نیکیاں بڑھا کر یا گناہوں کو کم کر کے اس کمی کو پوری فرماتا ہے۔ ان روایات سے اس بات کی مکمل تائید ہوتی ہے کہ غیبت بندوں کے حقوق میں سے ہے۔

...

غیبت عبادتوں کی منزل کو گھٹا دیتی ہے

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیبت وضو اور روزے کو باطل کر دیتی ہے۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔

الجلوس فی المسجد انتظاراً للصلواۃ عبادۃ مالم یحدث فقیل یارسول اللہ وما الحدث؟ قال الاغتیاب۔

"مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنا عبادت ہے جب تک کوئی حدث صادر نہ ہو۔ سوال کیا گیا، یا حضرت حدث کیا ہے؟ فرمایا غیبت۔!"

دوسری حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

ومن اغتاب مسلماً بطل صومه ونقض وضوءه

"جو کسی مسلمان کی غیبت کرتا ہے اس کا وضو اور روزہ باطل ہو جاتا ہے۔"

اس میں شاید یہ راز ہو کہ عبادت انسان میں ایک حالت تقرب ومعنویت پیدا کرتی ہے اور جب انسان وضو یا روزے کی حالت میں اپنی زبان کو غیبت جیسے گناہ سے آلودہ کر لیتا ہے تو وہ معنویت اور نورانیت کم ہو جاتی ہے اور انسان قرب پروردگار کی منزل سے دور ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ روایت میں ناقص سے اسی امر کی طرف اشارہ ہو۔

غیبت انسان کو خدا سے علیحدہ اور شیطان سے قریب کرتی ہے

عمر بن مفضل نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ:۔

"من روى على مومن رواية يريد بها شينه وهدم مروته ليسقطه من اعين الناس اخرجه الله من ولايته الى ولاية الشيطان فلا يقبله الشيطان۔"

"جو شخص کسی مومن کے بارے میں کوئی بات اس مقصد سے کہے کہ لوگوں کی نظر میں اسے ذلیل اور رسوا کرے خداوند عالم اسے اپنی سرپرستی سے نکال کر شیطان کی سرپرستی میں دے دیتا ہے اور شیطان بھی اسے قبول نہیں کرتا۔"

اگرچہ یہ روایت صرف غیبت سے مختص نہیں ہے لیکن غیبت کو بھی شامل ہے کیونکہ عام طور سے غیبت میں مقابل کو ذلیل و رسوا کرنے کا قصد کسی نہ کسی عنوان سے ضرور مضمر ہوتا ہے بلکہ غیبت کے خواص میں سے ہے جو معمولاً غیبت سے جدا نہیں ہوتا۔

اب آیئے آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ولایت کے معنیٰ تلاش کئے جائیں کہ کن معنیٰ میں یہ لفظ استعمال ہوئی ہے:۔

خداوند عالم مومنین کی ہدایت ورہبری کا ذمہ دار ہے، انھیں تاریکی وگمراہی سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور غیبت کرنے والوں کی رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے کیونکہ "ولی" قرآن مجید میں رہبر، رہنما اور یاور و مددگار کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وما كان لهم من اولياء من دون الله۔ (شوریٰ-۴۶)

"خدا کے علاوہ ان کا کوئی یاور و مددگار نہیں ہے۔"

ذلت سے نجات دلانے والے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے:۔

ولم يكن له شريك فى الملك ولم يكن له ولى

من الذل. (اسراء - ١١)

" نہ اس کی مملکت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ ذلت سے نجات دلانے والا"

ولی گناہ بخشنے والے کے معنی میں بھی آیا ہے جیسے:-

انت ولینا فاغفرلنا وارحمنا وانت خیر الغافرین (اعراف - ١٥٥)

"تو ہمارا بخشنے والا ہے ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما کہ تو بہترین بخشنے والا ہے۔"

اس بیان کے بعد یہ بات روشن ہو گئی کہ غیبت کرنے والے خدا کی ولایت سے خارج اور شیطان کی ولایت میں شامل ہونے کے بعد ان تمام فیوض و برکات سے محروم ہو جاتے ہیں اور جملہ فلا یقبلہ الشیطان سے شاید یہ مراد ہو کہ شیطان کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ ان کی سرپرستی و رہنمائی کر سکے، لہذا وہ بھی انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

غیبت کے بعض اثرات توبہ کے بعد بھی باقی رہتے ہیں

رہبران اسلام علیہم السلام سے روایت ہے کہ:-

اوحی اللہ عزوجل الی موسیٰ ابن عمران ان المغتاب اذا تاب فھو اٰخر من یدخل الجنۃ وان لم یتب فھو اول من یدخل النار۔

"خداوند عالم نے حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ غیبت کرنے والا اگر توبہ کر لے تو سب سے آخر میں جنت میں داخل کیا

جائے گا۔ اور اگر توبہ نہ کرے تو سب سے پہلے اسے دوزخ میں ڈالا جائیگا۔"

ممکن ہے کہ حدیث میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ غیبت حق اللہ بھی ہے اور حق الناس بھی اور اس کا حق الناس ہونا لوگوں کے دوسرے تمام حقوق سے اہم ہے کیونکہ غیبت انسانوں کے سرمایہ آبرو کو برباد کرنے والی ہے اور یہ ایسا سرمایہ معنوی ہے جس کا تدارک برخلاف مادی سرمایوں کے امکان سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیبت کرنے والے کو سب سے آخر میں نجات ملے گی۔ اسی وجہ سے بعض روایات میں ہے کہ مسلمان کی اہانت کرنا سب سے بڑی سود خوری ہے جیسا کہ انس نے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کی ہے، آپؐ نے فرمایا:-

ان اربی الربا عرض الرجل المسلم

"اہم ترین سود مسلمان کی آبرو ریزی ہے۔"

غیبت کے انفرادی و اجتماعی مفاسد

غیبت کے سماجی مفاسد بہت اہم اور خطرناک ہیں۔

١۔ اگر غیبت معاشرہ میں رائج ہو جائے تو اس کی وجہ سے سب سے بڑا اجتماعی سرمایہ یعنی اتحاد و اخوت اور اخلاص و محبت کا وجود باقی نہیں رہتا، اور باہمی اعتماد و اعتبار اور حسن ظن جو سماجی زندگی کی روح رواں ہے، اس کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں کیونکہ غیبت کا رواج اس بات کا سبب بنتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی پوشیدہ برائیوں اور کمزوریوں سے باخبر ہوں جبکہ عام طور سے سبھی انسان کسی نہ کسی کمی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان برائیوں کا علم ہونے کے بعد معاشرہ کے اندر ایک بدگمانی کا ماحول سایہ فگن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے سب ایک دوسرے سے بدظن ہو کر باہمی تعاون

اور ہم کاری کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں جس کے نتیجہ میں اجتماعی زندگی کے تمام فیوض و برکات سے محروم ہوجاتے ہیں۔ ان حالات سے دوچار ہوکر پستی اور تنزل کا شکار ہوجاتے ہیں۔ روایت :

لا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تغتابوا وکونوا عباد اللہ اخوانا۔ (آپس میں حسد مت کرو اور نہ دشمنی رکھو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو بلکہ اے خدا کے بندو! بھائی بھائی بن کے رہو)

جس کا ذکر پہلے گزر چکا، اسی امر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۲۔ غیبت اکثر و بیشتر لوگوں کے درمیان کینہ وعداوت اور فتنہ وفساد کی آگ کو بھڑکا دیتی ہے کیونکہ پوشیدہ عیوب کا تعلق زیادہ تر دوسروں کے حقوق سے ہوتا ہے اور ہوا دینے والوں کو لڑانے کے لئے ایک ثبوت فراہم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے عداوت شدید اور خطرناک موڑ اختیار کرلیتی ہے۔

۳۔ غیبت لوگوں کے عزت و احترام کو خاک میں ملا دیتی ہے

اور عزت و احترام کم ہوجانے کی وجہ سے انسان کی نظر میں گناہوں کی اہمیت اور اس سے وحشت کم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ اپنی عزت و وقار کو باقی رکھنے کے لئے گناہوں سے کنارہ کشی اختیار کرلیتے ہیں اور اگر انجام بھی دیتے ہیں تو مخفی طریقہ سے۔ لیکن جب غیبت ان کی برائیوں کو آشکار کردیتی ہے تو وہ بے پروا ہوکر اس گناہ میں ملوث ہوجاتے ہیں۔ اس طرح غیبت معاشرہ میں برائیوں اور فساد کے اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

۴۔ غیبت سماج کے اقتصادیات پر بھی کافی اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ اقتصادی مسائل کا دار و مدار باہمی اعتماد و اعتبار پر ہے اور یہ باہمی اعتبار و اعتماد دوسرے

مالی سرمایوں سے کہیں زیادہ سماجی اقتصاد اور معاشی ترقی کے لئے موثر ہے اور بغیر اس کے معاشرہ اقتصادی اعتبار سے بجائے ترقی کے تنزلی اور پستی کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہ تھے غیبت کے اجتماعی مفاسد۔

غیبت کے اثرات فردی زندگی پر

غیبت انفرادی حیثیت سے دوسروں کے حقوق پر کھلا ہوا ظلم اور تجاوز ہے اور وہ تمام اخلاقی و انسانی نقائص جو ایک ظالم میں ظلم کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، غیبت کرنے والے کے لئے بھی ہیں اس کے علاوہ چونکہ غیبت کا سرچشمہ بعض اخلاقی صفات رذیلہ ہیں اس لئے غیبت کی تکرار انسان میں ان صفاتِ رذیلہ کی تقویت کا سبب بنتی ہے۔ اس طرح غیبت انسان کو انسانیت سے گرانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے جیسا کہ گزشتہ آیات و روایات میں ان حقائق پر اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے

دائرۂ غیبت اور اُسکے حدود

۱۔ غیبت کی قسمیں

ابتداءً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیبت زبان سے دوسروں کے پوشیدہ عیوب کے اظہار کا نام ہے لیکن اس کے اصل مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غیبت علم اخلاق کے اعتبار سے ایک عام اور وسیع مفہوم کی حامل ہے یعنی ہر وہ طریقہ جس سے کسی کے پوشیدہ عیوب کا اظہار ہو، چاہے زبان کے ذریعہ ہو یا قلم کے ذریعہ یا قلم سے یا اشارہ اور نقل سے، اسے غیبت شمار کیا جائے گا جیسا کہ

پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے کہ ایک عورت پستہ قد آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی، جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو حضرت عائشہ نے اس کے قد کی طرف اشارہ کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم نے اس عورت کی غیبت کی ہے۔[۱]

اور دوسری حدیث میں ہے کہ جناب عائشہ نے ایک عورت کی نقل کرنی شروع کی آنحضرتؐ نے ان کو منع فرمایا۔[۲]

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دوسروں کے افکار و نظریات پر تنقید و تبصرہ بھی اس انداز میں نہ ہونا چاہیئے جو غیبت کا مصداق بن جائے حالانکہ لوگ زیادہ تر دوسروں کی عبارت پر اس انداز میں تنقید و اعتراض کرتے ہیں کہ واضح طور پر اس میں غیبت، مذمت، تحقیر و توہین یا استہزاء کا پہلو پایا جاتا ہے۔ جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں مطلب بالکل باطل ہے یا مضحکہ انگیز ہے یا اس میں بچپنا ہے یا یہ مطلب بالکل غیر عاقلانہ ہے۔ اگر اس نظریہ کا مالک نامعلوم نہیں ہے یا ایسا شخص نہیں ہے جس کی غیبت اور تحقیر جائز ہے تو یہ ساری عبارتیں غیبت کا مصداق قرار پاتی ہیں اور اس طرح کی تنقید حرام اور ناجائز ہے۔

اسی طرح کبھی کوئی شخص کنایہ میں کوئی بات کہتا ہے لیکن بعض قرائن ایسے ہوتے ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی مراد کون شخص ہے یہ بھی غیبت ہے جیسے یوں کہا جائے کہ آج میں ایک شخص کے درس میں تھا وہ یوں کہہ رہا تھا جبکہ سننے والے کو معلوم ہے کہ وہ کس کے درس میں گیا تھا۔

۲۔ غیبت دوسرے گناہوں کے ساتھ

کبھی کبھی یہ بدترین گناہ دوسرے بعض گناہوں کے ساتھ مخلوط ہو کر ایک نئی

۱-۲ احیار العلوم ج ۳ ص ۱۴۵

شکل میں رونما ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی مقدس اور مذہبی شکل و صورت میں ظاہر ہوتا ہے جیسے بعض لوگ غیبت سے پرہیز کرنے کے انداز میں کہتے ہیں کہ توضیح دوں کہیں غیبت نہ ہو جائے یا اس سے بڑھ کر کہتے ہیں کہ افسوس کہ شرع نے ہماری زبان سی دی ہے یا یوں کہ شرع اجازت نہیں دیتی ورنہ بہت کچھ کہتا۔ یہ بھی غیبت کا ایک انداز ہے کہ کنایۃً انسان غیبت کا مرتکب بھی ہوتا ہے اور موضوع کو مبہم رکھ کے مقابل کی شخصیت کو مزید مُتّہم بنا دیتا ہے۔

اور اس طرح موضوع کو واقعیت سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل بنا دیتا ہے۔ ایسے لوگ ایک ہی وقت میں دو خطرناک گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، ایک غیبت اور دوسرے ریاکاری۔

ایسے ہی بعض لوگ ہمدردی اور دل سوزی کے انداز میں اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں بے چارے فلاں شخص کے قدم میں لغزش ہوگئی اور فلاں گناہ کا مرتکب ہوگیا۔ خدا اسے بخشے۔ اس میں غیبت کے ساتھ ساتھ ریاکاری بھی شامل ہے۔

اسی طرح غیبت کے ساتھ کبھی کبھی خودستائی شامل ہوتی ہے جیسے لوگ کہتے ہیں کہ "الحمدللہ میں فلاں کی طرح شراب وغیرہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ واقعی اگر خدا انسان کو محفوظ نہ رکھے تو محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔" اس طرح انسان غیبت کے ساتھ ریاکاری اور خودستائی جیسے گناہوں کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر بھی لوگ غیبت کو جائز بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں ان برائیوں کا ذکر اس شخص کے سامنے بھی کر چکا ہوں، یا اس کے سامنے بھی کہہ سکتا ہوں۔ اس طرح یہ بے بنیاد استدلال پیش کر کے غیبت کی حرمت کو اور شدید تر بنا دیتے ہیں۔

۲. غیبت لوگوں کے حقوق میں سے ہے

غیبت کی جو تفسیر ابتداءِ بحث میں کی گئی ہے اس کے اعتبار سے غیبت کا حق الناس ہونا بالکل واضح ہے۔

کیونکہ اوّلاً غیبت کے ذریعہ انسان کی شخصیت اور اس کے احترام و عزت میں کمی واقع ہوتی ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ ان چیزوں کی اہمیت شرعاً و عقلاً مال سے کم نہیں ہے۔

دوسرے: غیبت کو قرآن کریم نے مومن بھائی کے گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے بھی یہ بات روشن ہوتی ہے کہ غیبت مصداقِ ظلم ہے جس سے حق ثابت ہوتا ہے۔ (سورۂ حجرات)

تیسرے: بہت سی روایات میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہے جیسے وہ روایت جس میں ہے کہ غیبت کی وجہ سے غیبت کرنے والوں کی نیکیاں اس شخص کے نامہ اعمال میں منتقل ہو جاتی ہیں جس کی اس نے غیبت کی ہے اسی طرح وہ روایت کہ غیبت کرنے والا اس وقت تک نہیں بخشا جائے گا جب تک وہ شخص نہ معاف کر دے جس کی غیبت کی ہے۔

اسی طرح نبیؐ کی روایت:۔ کفارة من استغبته ان تستغفرله (غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس کے لئے استغفار کرے)۔

اور وہ روایات جو ترک غیبت کو مومن کے حقوق میں سے شمار کراتی ہیں۔

غیبت ظلم کا بہت ہی واضح مصداق ہے جو بغیر طرف کی رضایت کے قابل معافی نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غیبت کا کفارہ صرف توبہ و استغفار نہیں ہے۔ ہاں اگر اور کوئی راستہ رضایت کا ممکن نہ ہو یا غیبت سے عملی طور پر اس شخص کی عزّت و حیثیت پر کوئی حرف نہ آیا ہو تو ممکن ہے کہ صرف

استغفار کافی ہو۔

غیبت کے مستثنیٰ موارد

فقہا و علمائے اخلاق اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ بعض مقامات پر غیبت جائز ہو جاتی ہے لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ وہ موارد کون سے ہیں۔ یہ اختلافات کہیں کہیں صرف مثالوں اور مصادیق میں ہیں اور کہیں کہیں واقعی اور معنوی اعتبار سے۔

لیکن جو دلیلوں اور مدارک سے ثابت ہیں وہ صرف دو مورد ہیں جہاں غیبت جائز ہے۔

الف۔ وہ موارد جہاں غیبت کے مصالح اس کے مفسدہ سے اہم اور قوی ہوں اور اس کے مصادیق بہت ہیں جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱) مشورہ کے موقع پر

جیسے کوئی چاہتا ہے دوبارہ کوئی معاملہ کرے یا کسی کو شریک بنائے، یا شادی کے لئے مشورہ یا تحقیق چاہتا ہے ان مقامات پر بلا شبہ اس شخص کے وہ تمام عیوب جن کا تعلق اس مسئلہ سے ہے اسے بیان کیا جا سکتا ہے اور مشورہ طلب کرنے والے کو تمام احتمالی خطروں اور نقصانات سے نجات دینا چاہئے۔

(۲) برائی سے روکنے (نهى عن المنكر) کے لئے بھی غیبت جائز ہے۔

(۳) کسی بدعتی شخص کی بدعت کو رفع کرنے کے لئے

(۴) کسی مسلمان کو خطرہ یا نقصان سے آگاہ کرنے کے لئے اگرچہ اس نے مشورہ بھی نہ طلب کیا ہو۔

(۵) طلبِ حق و انصاف اور دفع ظلم کے لئے

اور بالعموم ان تمام مقامات پر جہاں مخفی عیوب کے اظہار میں شرعاً مفسدہ سے زیادہ مصلحت ہو، ایسے مقامات پر مصلحت کی اہمیت کی بنا پر غیبت جائز ہوتی ہے ان موارد کے مستثنیٰ ہونے کی دلیل بالکل واضح ہے کیونکہ یہاں پر عقلی دلیل قاعدہ اہم اور مہم بالکل واضح ہے اس کے علاوہ آیات و روایات میں بھی ان بعض موارد کے لئے اشارے موجود ہیں جیسے طلب حق و انصاف اور دفع ظلم اور کسی بدعت کو دفع کرنے کے لئے۔

لیکن جس نکتہ کا ذکر علم اخلاق کی رو سے یہاں ضروری ہے وہ یہ کہ اس بات کی طرف خاص توجہ ہونی چاہیئے کہ زیادہ تر لغزش و انحراف انھیں استثنارات سے غلط استفادہ کی بنا پر ہوتی ہے یا ان کے حدود کی تعیین میں غفلت یا اشتباہ کی بنا پر انسان لغزش کا شکار ہو جاتا ہے۔

کیونکہ سب لوگ کسی قانون کی صریحی خلاف ورزی یا گناہ کے ارتکاب کی جرأت نہیں رکھتے بلکہ اکثر لوگ اپنے مقاصد استثناءات کی آڑ میں حاصل کرنا چاہتے ہیں اس طرح اکثر موارد پر انسان خود اپنے ضمیر کو اس طرح دھوکہ دیتا ہے اور ملازمت نفس سے فرار کرنے کے لئے ان موارد سے غلط فائدہ حاصل کرتا ہے یہ ضمیر ناآگاہ اور ضمیر آگاہ کے درمیان ٹکراؤ کے موارد میں سے ایک مورد ہے جہاں ضمیر ناآگاہ ضمیر آگاہ پر کامیابی حاصل کرتا ہے۔

لہذا چاہئے کہ بہت دقت کے ساتھ ان موارد پر غیبت کے مصالح اور مفاسد کا تمام جہات سے جائزہ لینے کے بعد بغیر کسی تعصب اور جنبہ داری کے صاف صاف غیبت کے مصالح و مفاسد کا موازنہ کر کے اگر غیبت کے مصالح مفاسد پر غالب ہوں تو اس کو مقدم کرے، اور اس بہانے سے اپنے کو خطرناک غیبتوں میں ملوث کر کے

گناہ گار نہ ہو۔

(ب) وہ موارد جہاں بغیر کسی خاص مصلحت کے بھی غیبت جائز ہے۔

یہ موارد ان لوگوں سے مخصوص ہیں جو علی الاعلان فسق انجام دیتے ہیں کیونکہ مسئلہ طلب انصاف و رفع ظلم کو اگرچہ اس قسم میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ یہ مورد اہم اور مہم کا مصداق ہے کیونکہ شرعاً ظالم سے حق دلانا اور مظلوم کی حمایت میں جو مصلحت ہے وہ غیبت کے مفسدہ سے اہم ہے۔

اس موضوع کے مستثنیٰ ہونے کی دلیل عقل کے علاوہ متعدد روایات بھی ہیں جو فریقین سے منقول ہیں جیسے:

(۱) آنحضرت صلعم سے روایت ہے: ثلثة ليس لهم حرمة: صاحب هوى مبتدع والامام الجائر والفاسق المعلن بفسقه[۱]

"تین طرح کے لوگوں کے لئے احترام نہیں ہے (۱) شخص بدعت گزار (۲) ظالم حکمراں (۳) اعلانیہ فسق انجام دینے والا۔

بعض دوسری روایتوں میں اس موضوع کو یوں بیان کیا گیا ہے:

ثلثة لا غيبة لهم صاحب الهوى والفاسق المعلن بفسقه والامام الجائر[۲]

"تین طرح کے لوگوں کی غیبت حرام نہیں ہے (۱) شخص بدعت گزار، (۲) اعلانیہ معصیت کرنے والا (۳) ظالم حکمراں"

---

[۱] مکاسب مرحوم شیخ

[۲] احیاء العلوم

یہ روایت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

(۲) لیس لفاسقٍ غیبۃ[1] "فاسق کے لیے غیبت نہیں ہے (یعنی حرام نہیں ہے)۔

(۳) یہ بھی روایت ہے: من القی جلباب الحیاء فلا غیبۃ لہ[2] جو شخص حیاء کے پردہ کو چاک کر دے اس کے لئے غیبت نہیں ہے (یعنی حرام نہیں ہے)"۔

(۴) وہ بہت سی روایات جو وسائل الشیعہ میں عدالت کے بارے میں مذکور ہیں ان میں سے یہ روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہے:۔

من عامل الناس فلم یظلمھم وحدثھم فلم یکذبھم وواعدھم فلم یخلفھم کان ممن حرمت غیبتہ وکملت مروتہ وظھر عدلہ ووجب اخوتہ۔ (وسائل الشیعہ)

"جو شخص معاملات میں لوگوں کے ساتھ ظلم نہ کرے اور لوگوں سے جھوٹ نہ بولے اور وعدہ خلافی نہ کرے وہ ان لوگوں میں ہے جس کی غیبت حرام ہے اور شخصیت کامل اور اس کی عدالت واضح اور آشکار ہے، اس کے ساتھ برادری کا برتنا واجب ہے"۔

یہاں چند موضوعات کی وضاحت کرنی ضروری ہے:

(الف) یہاں فاسق کا استثناء تخصّصاً اور اس موضوع سے خارج ہونے کے

---

[1] المحجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۶۲

[2] اس حدیث کو بیہقی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

اعتبار سے ہے (یعنی جو شخص اعلانیہ گناہ انجام دیتا ہے اگر اس کی غیبت کی جائے تو وہ رنجیدہ نہیں ہوتا، یا وہ موضوع اس کے لئے مخفی نہیں ہوتا کہ اس کا ذکر غیبت قرار پائے) یا یہ کہ غیبت تو ہے لیکن اس مورد کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔؟

(ب) فاسق کی غیبت مخصوص ہے انھیں گناہوں سے جن کو وہ علی الاعلان انجام دیتا ہے یا تمام موارد میں جائز ہے۔؟

(ج) اگر کوئی شخص ایک مقام پر اعلانیہ فاسق ہے لیکن دوسری جگہ اس کا فسق مخفی ہے تو اس کی غیبت دوسری جگہ بھی جائز ہے۔؟

(د) اعلانیہ فاسق کی غیبت کے جواز کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے شرائط کا پایا جانا ضروری ہے یا نہیں۔؟

ان تمام سوالات کا جواب اصل نکتۂ جواز کی طرف توجہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔

جو بات احادیث بالا سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ شخص جو اعلاناً فاسق ہے اس کا احترام نہیں ہے (وہی احترام جس کی بنا پر اس کی غیبت حرام ہے) دوسرے لفظوں میں یہ لوگ اور ظالم و بدعتی افراد معاشرہ میں محترم نہیں ہیں اور ان کی توہین و بے احترامی حرام نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی غیبت سے بچنا اور ان کی آبرو کا تحفظ ضروری نہیں ہے۔

اگر ہم احادیث مذکور سے یہ استفادہ کریں جیسا کہ روایات میں "لا غیبۃ لہ و لا حرمۃ لہ" کی تعبیر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ سوالات بالا کا جواب خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور مزید توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ اصولی طور پر ایسے افراد کے لئے غیبت کی عقلی و نقلی دلیلیں شامل نہیں ہیں لیکن

س بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ متجاہر یعنی کھلے ہوئے فاسق سے مراد وہ شخص ہے جس نے حیاء کے پردہ کو بالکل چاک کردیا ہو اور گناہوں کے مقابلہ میں جری اور جسور ہو چکا ہو۔ اس بنا پر وہ تمام لوگ جو کسی سبب سے کوئی ایک گناہ اعلاناً انجام دیتے ہیں وہ مراد نہیں ہیں اور ایسے لوگوں کی غیبت صرف اسی مورد کے لئے جائز ہے جسے وہ لوگ اعلاناً انجام دیتے ہیں۔

(حصہ اوّل تمام شد)

26

دیگر مطبوعات

- الحج ―――― ۵/-
- دُنیا بازیچۂ یہود ―――― ۵/-
- کربلا شناسی ―――― ۱۵/-
- امام زین العابدین علیہ السلام ―――― ۵/-
- نظام اسلام ―――― ۵/-
- امام علی رضا علیہ السلام ―――― ۶/-
- اصُول دین ―――― ۲۵/-
- امام محمد باقر علیہ السّلام ―――― ۱/۵۰
- فلسفۂ انتظار (جدید اڈیشن) ―――― ۸/-
- تفسیر رموز التنزیل حصۂ اوّل ―――― ۲۲/-
- بیسویں صدی میں اسلامی تحریکیں ―――― ۵/-
- امام محمد تقی علیہ السلام ―――― ۴/-
- دین و دیانت ―――― ۴/-
- امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام ―――― ۳/-
- حَیاتِ آخرت ―――― ۵/-
- امام جعفر صادق علیہ السلام ―――― ۵/-
- زندگی اخلاق کے سائے میں ―――― ۱۰/-
- حضرت علی علیہ السلام ―――― (زیر طبع)
- اتمام حُجّت ―――― ۲۰/-
- حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام ―――― (زیر طبع)
- دھرم کے مول تتو (اصول دین ہندی) ―――― (")
- امام علی نقی علیہ السّلام ―――― "
- حضرات حسنین علیہما السلام ―――― "

Rs. 10.